تعلیم و تربیت

سالنامہ
مئی 1993ء

تحفہ

سالنامے کے ساتھ اخبار فروش سے

سن شیڈ

مفت لیجیے

Sharjeel Ahmed

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلام علیکم

اِس سال تعلیم و تربیت کے دو خاص نمبر شائع ہوئے۔ ایک کہانی نمبر، جو جنوری میں چھپا تھا اور آپ نے اُس کی دل کھول کر تعریف کی تھی، اور دوسرا یہ سال نامہ جو اِس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اِسے کہانی نمبر سے زیادہ پسند کریں گے، اور ہماری محنت کی داد دیں گے۔ ہم اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر سال نامے کے لیے اچھی اچھی کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔

اور ہاں، جیسا کہ ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا، اِس رنگا رنگ سال نامے کے ساتھ آپ کو ایک خوب صورت اور کار آمد تحفہ بھی دیا جا رہا ہے۔ یہ ہے "سن شیڈ" یعنی دُھوپ روک۔ اِسے ماتھے پر لگا کر آپ باہر نکلیں گے تو یہ آپ کی آنکھوں کو دھوپ سے محفوظ رکھے گا۔

اِس ماہ سے تعلیم و تربیت میں، قسط وار ناول کے علاوہ، ایک نیا سِلسِلہ "چٹ پٹے، مسالے دار" شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ کو بھی کوئی ایسا دل چسپ واقعہ پیش آیا ہو جسے پڑھ کر ہمارے ساتھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں تو اُسے لکھ کر ہمیں بھیج دیجیے۔ زیادہ سے زیادہ 20 سطریں ہوں۔ اِس کے لیے فی الحال دو صفحے مخصوص کیے گئے ہیں۔ آپ نے اِس میں دل چسپی لی تو صفحات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اِس شمارے میں

اداریہ		1
میرا اللہ (حمد)	پروفیسر خالد بزمی	2
وہ بھیانک رات (کہانی)	پروفیسر محمد یونس حسرت	3
سزا (کہانی)	ذکیہ بلگرامی	9
بزدل چچا بہادر شکاری (کہانی)	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	14
یتیم بچوں کے حقوق	ڈاکٹر عبدالرؤف	16
محبت کرنا سیکھو	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	17
اندھیری رات میں ایک بوڑھا (کہانی)		19
سائنس کے کھیل		24
واوا ابا کی سالگرہ (کہانی)	سید نظر زیدی	25
آئیے، مسکرائیں		30
ٹھنڈی میٹھی آئس کریم		31
آئیے دوست بنائیں		32
آؤ اب آرام کریں (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	33
قدرت کے عجوبے	س۔ ل	34
بستہ کہاں گیا؟ (کہانی)	اشتیاق احمد	36
کیا، کیوں، کیسے	س۔ ل	40
غدار (کہانی)	ابن الحق	42
...... سلام کہتی ہیں (کہانی)	شکیل زاہد	45
چٹ پٹے، مسالے دار		52
آپ بھی لکھیے		54
پیارے پیارا پاکستان (نظم)	فرحت شاہجہان پوری	58
واوا جان کا حلوا (کہانی)	محمد ادریس قریشی	59
خواہش کا وہل (کہانی)	مستاب اسلم	65
آپ کا خط ملا		69
وقوری علمی آزمائش		71
چڑیلوں کی سرائے (ناول)	رضوانہ سید علی	73
ہونہار مصور		79
عظیم مسلمان	عین الحق فرید کوٹی	80

...واں سال

...دوسرا شمارہ

...لیم و تربیت

...میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

...کا محبوب رسالہ

...یٹر: عبدالسلام

سعید لخت

...کیٹر: محمود حسن روی

...سسٹنٹ: محمد بشیر راہی

...طبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

ظہیر سلام

عبدالسلام

پتا

...ہ تعلیم و تربیت

...شارع بن بادیس لاہور

6361309-63613010

6278815-6278816

...سرکولیشن اور اکاؤنٹس

...شاہراہ قائد اعظم لاہور

سالانہ قیمت

...صرف رجسٹری کے ساتھ) -/200 روپے

...افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/300 روپے

...ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے

...بعید (ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے

1993

قیمت عام شمارہ -/9 روپے

قیمت سالنامہ -/12 روپے

میرا اللہ

میرا اللہ سب سے اُونچا، سب سے عالی ہے
وُہی ہے میرا خالق و رازق اور وہی والی ہے
اُس کی عظمت سب سے انوکھی اور نرالی ہے
آسمان کو اُس نے بخشا روشن روشن چاند
جس کے آگے لعل اور ہیرے ہو جاتے ہیں ماند
اُس نے سجائی پھولوں پھلوں سے ڈالی ڈالی ہے
صُبح کو جس دَم سُنتا ہوں مَیں چڑیوں کی چہکار
میری سانسوں میں جب آئے پھولوں کی مہکار
دِل کہتا ہے اِس گُلشن کا کوئی مالی ہے
اللہ کی عظمت کا مُنکِر کوئی شخص نہیں
اور اگر کوئی ایسا ہو تو ہے مُجھے یقیں
بے شک اُس کے ذہن کا خانہ عقل سے خالی ہے
کوئی مُلک ہو، کوئی شہر ہو، کوئی بستی ہو
کوئی ذات ہو، کوئی شخص ہو، کوئی ہستی ہو
اُس کے در کا اے بزمی ہر شخص سوالی ہے

خالد بزمی

وہ بھیانک رات

محمد یونس حسرت

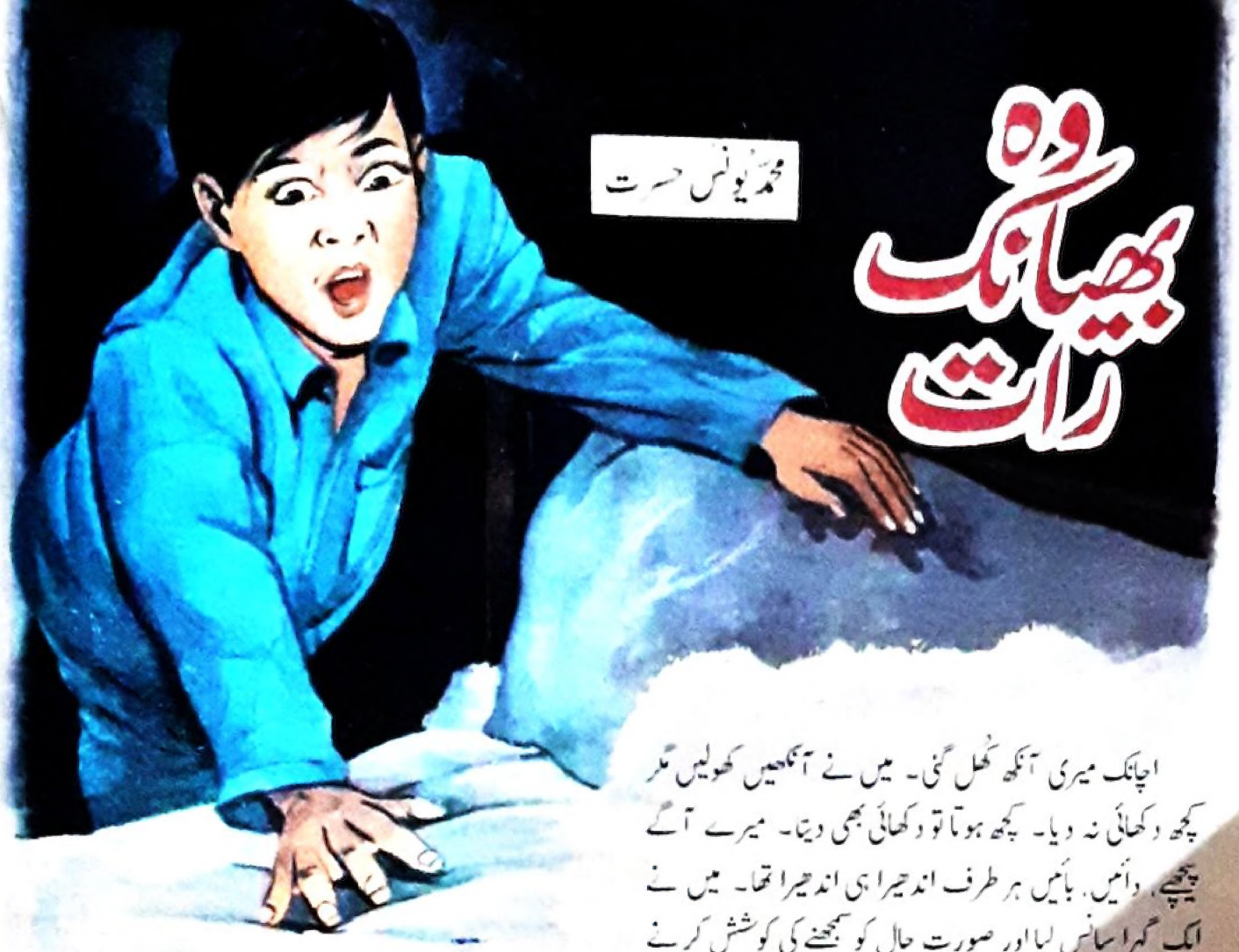

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ کچھ ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ میرے آگے پیچھے، دائیں، بائیں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرا تاریکی میں اس لیے ڈوبا ہوا تھا کہ رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی۔ اِتنی بات تو صاف تھی، مگر وقت کیا تھا؟ رات کے بارہ کا عمل تھا یا صبح کے ایک یا دو بج رہے تھے؟ اِس بارے میں کوئی اندازہ لگانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میری اندھیرے میں وقت بتانے والی گھڑی خراب تھی اور میں اُسے مرمّت کے لیے گھڑی ساز کو دے آیا تھا۔

یہ کمرا میرے گھر کا کمرا نہ تھا۔ یہ خالہ سعیدہ کے مکان کا کمرا تھا۔ میں نہ صرف پہلی دفعہ اُن کے ہاں آیا تھا بلکہ میں نے اِس سے پہلے اُنہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ اَلبتّہ اُن کا نام والِدہ اور رشتے داروں کی زبانی ضرور سُنا تھا، مگر دیکھنے کا اِتّفاق اب ہُوا تھا۔

میں سہ پہر کے وقت یہاں پہنچا تھا اور مجھے دیکھ کر خالہ سعیدہ کے ہونٹوں پر جو کڑوی اور ناگوار سی مسکراہٹ اُبھری تھی، وہ اب بھی مجھے یاد ہے۔ پھر جب وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے مکان کے اندر لے گئی تھیں تو بار بار میری طرف ایسے دیکھ رہی تھیں۔ ایسے دیکھ رہی تھیں۔ ایسے۔ جیسے پولیس کا سپاہی ہتھکڑی لگے ہوئے مُلزِم کو دیکھتا ہے کہ کہیں یہ بھاگ نہ جائے۔ حال آں کہ میں خالہ سعیدہ کا مہمان بن کر آیا تھا، اُن کے ہاں سے بھاگنے کے لیے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مہمانی زبردستی کی مہمانی تھی۔

"تمہیں یہاں ویسا آرام تو نہیں ملے گا جس آرام کے تم اپنے گھر میں عادی ہو۔ مگر دو چار راتیں تو تم یہاں گزار ہی لو گے، کسی نہ کسی طرح" یہ کہہ کر خالہ سعیدہ مجھے دوسری منزل پر لے گئی تھیں۔

اِس مکان کی برسوں سے مرمّت نہیں ہوئی تھی۔ آرائش اور سجاوٹ تو دُور کی بات ہے، دیواروں پر سفیدی بھی مُدّت

سے نہیں کرائی گئی تھی۔ یہ بات بھی نہیں کہ پیسے نہ ہونے کے باعث ایسا ہُوا ہو۔ مجھے وہ باتیں اچھی طرح یاد تھیں جو والدہ اور دوسرے رشتے داروں کے درمیان گپ شپ کے دوران میں خالہ سعیدہ کے بارے میں سُننے میں آئی تھیں۔

"جب خالو ارشد کا انتقال ہُوا تو وہ کافی دولت مند تھے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اپنی ساری دولت خالہ سعیدہ کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ مگر وہ بُہت کنجوس ہیں۔ دوسروں کے ہاں اِس لیے نہیں جاتیں کہ کچھ لے کر جانا پڑے گا۔ اپنے ہاں کسی کو اِس لیے نہیں بُلاتیں کہ خاطر مُدارات پر پیسہ خرچ ہو گا۔ وہ تو شاید اپنی ذات پر بھی کچھ خرچ نہیں کرتیں۔ اُنھوں نے اپنے شوہر سے ملنے والی دولت کو کہیں چُھپا رکھا ہے اور اُن کا مکان مرمّت نہ ہونے کی وجہ سے روز بروز خستہ ہوتا جا رہا ہے۔"

خالہ سعیدہ کے بارے میں ایسی ہی باتیں میرے سُننے میں آئی تھیں۔ شاید یہ اِنہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اور ہمارے دوسرے رشتے داروں کے ہاں خالہ سعیدہ کا آنا جانا برائے نام تھا اور وہ خود بھی دوسرے رشتے داروں کے ہاں کم ہی آتی جاتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے اِس سے پہلے خالہ سعیدہ کے ہاں آنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ حال آں کہ وہ میری سگی خالہ تھیں اور میری والدہ سے کوئی دس سال بڑی۔ اور میں تو شاید اب بھی نہ آتا مگر بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔ والدہ پر اچانک دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئی تھیں۔ گھر پر میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا، اور میرے لیے سوائے اِس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ والدہ کے ہسپتال میں رہنے کے دوران میں زبردستی خالہ سعیدہ کا مہمان بنا رہوں۔ گو یہ بات ہر کسی کے علم میں تھی کہ خالہ سعیدہ بچّوں کو ناپسند کرتی ہیں۔

مگر جب خالہ سعیدہ نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ کمرے میں ایک نہیں، دو بستر لگے ہوئے تھے، اور کھڑکی کے ساتھ والے بستر پر لمبے قد، سُنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل صورت اور قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ مُجھ سے چار پانچ سال بڑا نظر آتا تھا۔

"یہ تُمھاری تیسری خالہ کے بہنوئی کا بھتیجا اور اِس حساب سے تمہارا کزن خالد ہے۔ تمہارے آنے کی اِطّلاع ملتے ہی میں نے اِسے بُلا لیا تھا۔ اُمید ہے تم دونوں ایک دوسرے کا دل بہلاتے رہو گے اور میرے لیے دردِ سر نہیں بنو گے۔"

خالہ سعیدہ کے یہ الفاظ سُنتے ہی میں نے اُس لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اگرچہ خالہ کے بہنوئی کے بھتیجے والی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی مگر خالہ سعیدہ کے بقول لمبے قد، سُنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا یہ لڑکا میرا کزن تھا۔ میرے لیے اِتنی بات ہی کافی تھی اور پھر وہ مُجھ سے چار پانچ سال بڑا بھی نظر آتا تھا۔

"السّلامُ علیکُم، خالد صاحب۔ مجھے صابر کہتے ہیں" میں نے خوش دِلی سے کہا۔

لیکن اُس نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بالکل نظر انداز کر دیا اور پھر بغیر مسکرائے بلکہ کسی قدر ڈانٹنے کے انداز میں کہنے لگا "دیکھو، مسٹر صابر! میرا نام خالد شاہین ہے۔ سب مجھے شاہین کہہ کر بُلاتے ہیں۔ تم بھی مجھے شاہین کہہ کر پکارنا۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا، جناب" میں نے گھبرا کر کہا۔

یہ سب کچھ مجھے یاد آ رہا تھا اور میں گھُپ اندھیرے میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کھڑکی کہاں ہے جس کے ساتھ والے بستر پر میں نے شاہین کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ اُس کھڑکی میں پردے بھی لگے ہوئے تھے جو سمٹے ہوئے ایک طرف لٹک رہے تھے۔ یہ پردے مخمل کے تھے اور پُرانے اور بد رنگ ہو جانے کے باوجود خاصے بھاری تھے۔ یقیناً میرے سو جانے کے کچھ دیر بعد شاہین نے پردے کھینچ دیے ہوں گے..... اِس خیال کے

ساتھ ہی مجھے اِحساس ہُوا کہ شاہین عُمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ اُس کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے اور اُس نے مجھے ستانے کے لیے کھڑکی کے پردے گرا دیے ہوں گے۔ شاہین نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُس کو دیکھتے ہوئے اُس سے کسی بھی شرارت کی توقع ہو سکتی تھی۔ بڑی عُمر کے لڑکوں کو ویسے بھی اپنے سے چھوٹے لڑکوں کو تنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ اِس خیال کے ساتھ ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"کوئی بات نہیں" میں نے دل میں کہا "میں اُدھر جا کر کھڑکی کے پردے ہٹائے دیتا ہوں۔ جب باہر کچھ دکھائی دے گا تو طبیعت کچھ سنبھل جائے گی اور اندھیرے سے اِتنا ڈر نہیں لگے گا۔"

مگر اندھیرے میں ایک نامعلوم کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کا فاصلہ طے کرنا اُس وقت میرے لیے ایک خطرناک مُہم سے کم نہ تھا۔ میں کچھ دیر تک بستر کی پٹّی سے پاؤں لگائے بیٹھا رہا، جیسے یہ کام کرنے کے لیے اپنے اندر ہمّت اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں نے بستر سے نیچے اُتر کر ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر رُک گیا۔ میں اپنے آپ سے بار بار سوال کر رہا تھا:

"کیا تمہیں یقین ہے کہ کھڑکی اِسی طرف ہے؟"

میرے چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا اور میں اس اندھیرے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کھڑکی کس طرف ہے۔ میں نے ڈرتے جھجکتے پھر ایک قدم اُٹھایا تو پاؤں ایک ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ یہ چیز میرے پاؤں کے ٹکرانے سے کمرے کے فرش پر یُوں لُڑھک گئی جیسے کوئی زندہ چیز ہو۔ میرے قدم وہیں رُک گئے اور مجھے اپنے گلے میں سانس اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اوہو! یہ تو میرا بُوٹ ہے جس سے میرا پاؤں ٹکرایا ہے۔ میں نے اپنے بُوٹ اُتار کر فرش پر بستر کے پاس ہی رکھ دیے تھے۔

اِس سے میرے حواس کچھ بجا تو ہوئے مگر میں کچھ گڑبڑا گیا تھا۔ اب میں وہاں رُک کر شاہین کے سانسوں کی آواز سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کھڑکی شاہین کے بستر کے ساتھ ہی ہے۔ اُس کے سانس کی آواز کا پتا چل جائے تو پھر کھڑکی کا پتا چلانا اور اُس تک پہنچنا دُشوار نہ ہو گا۔

میں نے کچھ سُننے کی بڑی کوشش کی مگر کچھ سُنائی نہ دیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید مجھے ڈرانے کے لیے شاہین نے سانس روک لیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ عین ممکن ہے وہ اِس طرح میری طرف لپکے جیسے شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے، اور پھر مُنہ سے کوئی خوف ناک سی آواز نکال کر مجھے ڈرا دے۔

پھر جیسے اچانک ہی میرا دل ہمّت اور حوصلے سے بھر گیا۔ میں اندھے کی طرح اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا:

"شاہین صاحب! میں کھڑکی کے پردے ہٹانے لگا ہوں۔ اِس اندھیرے میں میرا دم گھُٹ رہا ہے۔"

میری اِس بات کا کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ شاہین اگر سویا ہوا تھا تب بھی میری اُونچی آواز سے اُس کی آنکھ کُھل جانی چاہیے تھی، اور اگر وہ جاگ رہا تھا تو اُسے میری بات کا جواب دینا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو خاموشی تھی۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی۔

اِس خاموشی نے میرے دل میں تھوڑا سا ڈر تو پیدا کیا مگر میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ پھر میرے گھٹنے کسی پلنگ کی پٹّی سے ٹکرائے۔ میں شاید اِس کے لیے تیار نہ تھا۔ میں لڑکھڑا گیا اور گرنے سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

اِس کے ساتھ ہی میرے دونوں ہاتھ پلنگ کے گدّے اور چادر پر لگے۔ گدّا اور چادر ابھی تک گرم تھے۔ مگر پلنگ خالی تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ شاہین ابھی تھوڑی دیر پہلے بستر سے نکل کر کہیں چُھپ گیا ہے اور اب وہ کسی طرف سے مجھ

پر ایسے جھپٹے گا جیسے شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے۔ اور پھر مُنہ سے کوئی خوف ناک آواز نکال کر مجھے ڈرا دے گا۔ یا میرے ساتھ اِسی قسم کی کوئی اور شرارت کرے گا۔

مگر اُس وقت تو میرے جسم میں ہمّت اور حوصلے کی لہر نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ میں گھوم کر دوسری طرف گیا اور جی کڑا کر کے کہنے لگا:

"میں جانتا ہوں آپ کہاں چھُپے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ اپنے آپ کو ڈرا لیں تو ڈرا لیں، مجھے نہیں ڈرا سکتے۔ بالکل نہیں ڈرا سکتے"۔

میری اِس بات کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ خاموشی اور اندھیرا۔ اور اِس خاموشی نے سچ مُچ مجھے ڈرا دیا۔ اب میں کوئی بات بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ اب تو مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ میں واپس اپنے بستر تک بھی پہنچ سکتا ہوں یا نہیں۔ وہ ہمّت اور حوصلے کی لہر جو نہ جانے کہاں سے اور کیسے میرے جسم میں آ گئی تھی، ایک دم بجلی کے کرنٹ کی طرح میرے جسم سے نکل گئی اور اُس کی جگہ شدید خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ میں کھڑکی کے پردے ہٹانے کے ارادے سے اِس طرف آیا تھا، مگر پردوں کو بھول کر میں نے خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں اُس پلنگ کے ایک پائے کو اِس طرح پکڑ لیا جس طرح طوفان سے تباہ ہونے والے جہاز کا مسافر کسی ٹوٹے ہوئے تختے کو پکڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

طوفان!

باہر واقعی طوفان کی آمد آمد تھی۔ بادلوں کی گرج میں نے پہلے بھی سُنی تھی مگر اِس بار بادل کچھ زیادہ ہی زور سے گرجے اور اس کے ساتھ ہی بجلی بھی زور سے چمکی۔ اِس ایک لمحے کی روشنی میں مجھے کمرے کا دروازہ دکھائی دیا جس کے دونوں پٹ چند انچ کھُلے تھے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا، کیوں کہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ دروازے کے پاس سوئچ لگا ہوا ہے۔ اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ دروازے کے ایک پٹ سے لگا اور اُس سے ہوتا ہوا سوئچ تک پہنچ گیا۔ اور پھر اِطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر میں نے سوئچ دبایا۔ مجھے یقین تھا کہ سوئچ دباتے ہی کمرے میں روشنی ہو جائے گی اور روشنی ہوتے ہی اندھیرے کا وہ خوف رُخصت ہو جائے گا جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

مگر ہُوا کیا؟

کچھ بھی نہیں ہُوا۔ کمرا پہلے کی طرح تاریکی میں ڈُوبا رہا۔ میرے لیے یہ لمحہ خوف کا بدترین لمحہ تھا کیوں کہ اِس کی مجھے بالکل توقع نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی خوف ناک خواب سے جاگا ہوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ یہ خواب تو ابھی جاری ہے!

میں نے سوئچ کو کئی بار اُوپر نیچے کیا مگر میری ہر کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہر جو طوفان آیا ہے، اُس نے بجلی کے تاروں کو بھی نُقصان پہنچایا ہے۔ میں حیرت سے مُنہ کھولے کھڑا تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اور پھر مجھے ایک شور سا سُنائی دیا، جیسے کمرے کی دیوار کے نچلے حصّے میں لگے ہوئے لکڑی کے تختے میں کوئی چُوہا کھٹ پٹ کر رہا ہو۔ لیکن یہ چوہا عام چوہے سے کہیں بڑا معلوم ہوتا تھا کیوں کہ کھٹ پٹ خاصی زور دار تھی۔ جو چیز بھی یہ شور پیدا کر رہی تھی، وہ یقیناً بُری طرح خوف زدہ تھی۔

میں نے دن میں ایک سُوکھی سی، مریل سی بلّی کو اِس مکان میں گھومتے دیکھا تھا۔ اِس سے مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی بلّی ہے اور طوفان سے بچنے کے لیے کوئی پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے دل میں رحم اور ہم دردی کے جذبات اُمنڈ آئے۔ میں خود خوف کی کیفیّت سے دوچار تھا اِس لیے اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اِس بے چاری مریل سی بلّی کی خوف سے کیا حالت ہو گی!

ایک لمحے کے لیے میں اپنا خوف بھول گیا اور آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "پُس، پُس، پُس، پُس۔ ڈرو نہیں۔"

میرے یہ کہتے ہی کھٹ پٹ کی آواز بند ہو گئی۔ میں اپنے خیال کی آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ مریل سی بلّی خوف کے مارے ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ بڑھائے تو ہاتھوں کی اُنگلیاں لکڑی کے کھُردُرے تختے سے ٹکرائیں۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ یہ تو کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی پُرانے فیشن کی وارڈ روب یعنی کپڑوں کی الماری ہے۔ اِس سے میں نے خیال کیا کہ بلّی خوف کے مارے اس الماری میں جا گھُسی ہو گی۔ پھر کسی طرح الماری کا دروازہ بند ہو گیا ہو گا اور وہ بے چاری اندر بند ہو گئی ہو گی۔ اور اب وہ اپنے پنجوں سے الماری کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے الماری کے دروازے کا ہینڈل تلاش کیا اور اُسے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ مگر اندر کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بلّی ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہے، اُس کے بال کھڑے ہیں اور اُس نے پنجے آگے کیے ہوئے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اِس گھُپ اندھیرے میں اگر میں نے اِسے پکڑنے کی کوشش کی اور اِس نے پنجوں سے میرا مُنہ نوچ لیا تو کیا ہو گا؟

لیکن عین اُسی وقت ہمّت اور حوصلے کی لہر پھر میرے جسم میں دوڑ گئی اور میں نے بڑے حوصلے سے کہا "کوئی بات نہیں۔ تمہاری مدد کرنا میرا فرض ہے، بی مانو!"

یہ کہہ کر میں نے الماری کے اندر ہاتھ ڈالا تو کوئی مُلائم اور نرم نرم سی چیز میرے ہاتھوں کی اُنگلیوں سے مَس ہوئی۔ یہ بلّی کے بال نہیں تھے۔ کوئی اور چیز تھی، نرم نرم، گرم گرم اور کانپتی ہوئی۔ یہ کسی اِنسان کا چہرہ تھا!

ایک سنسنی سی میری ریڑھ کی ہڈّی میں دوڑ گئی اور سارا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے سے تر ہو گیا۔ میں کانپتی ہوئی آواز میں چیخا:

"کون ہے؟"

اور جواب میں ایک مری ہوئی سی آواز آئی "میں ہوں، شاہین!"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ تو اُس شاہین کی کھن کھناتی ہوئی آواز نہیں تھی جس نے دن میں مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔

عین اُسی لمحے کمرے کا دروازہ کُھلا اور خالہ سعیدہ ہاتھ میں موم بتّی لیے اندر داخل ہوئیں۔

"تم ٹھیک تو ہو، بچو؟ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں طوفان کی گرج چمک سے تم ڈر نہ گئے ہو اس لیے....."

اُنھوں نے بات ادھوری چھوڑ کر میری اور شاہین کی طرف دیکھا اور پریشان سی ہو کر کہنے لگیں "ارے! یہ کیا ہُوا، تم دونوں کو؟ ایک کے چہرے پر بارہ بج رہے ہیں اور دوسرا ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے!"

ہم نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں خالہ سعیدہ کو اپنی اپنی داستان سُنائی۔

شاہین نے کہا "مجھے بچپن ہی سے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں صابر کو باتوں میں لگا کر طوفان کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانا چاہتا تھا لیکن یہ سو گیا۔ اِس پر میں نے کھڑکی کے پردے گرا دیے تاکہ بجلی کی چمک اندر نہ آئے۔ اور..... اور پھر بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو کپڑوں والی الماری میں جا چھپا۔ آپ مجھے بہت بے وقوف اور ڈرپوک خیال کر رہی ہوں گی، خالہ جان۔"

"اُس وقت تو میری جان ہی نکل گئی جب میرے سوئچ دبانے کے باوجود کمرے میں روشنی نہیں ہوئی۔ شاید طوفان کی وجہ سے تاروں میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ میں تو.....۔"

"تاروں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے" خالہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے خود بجلی کٹوا دی تھی کیوں کہ میرے پاس بجلی کا بِل ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو۔"

"آپ کے پاس بجلی کا بِل ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں؟" میں نے حیرت سے کہا "ہم نے تو سُنا ہے کہ .....؟

"تمہاری خالہ سعیدہ بڑی امیر عورت ہے" خالہ نے مسکرا کر کہا "تم نے شاید ٹھیک ہی سُنا ہے۔ تمہارے خالو واقعی کافی دولت مند تھے۔ مگر جب اچانک اُن کا اِنتقال ہُوا تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ اُن کی یہ دولت کہاں ہے۔ میں نے گھر کا چپا چپا چھان مارا، بینکوں میں جا کر بھی پتا کیا مگر سب بے کار۔ آخر صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ میں ایک خود دار عورت ہُوں۔ میں نے اِس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا کیوں کہ میں دوسروں کی خیرات پر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خیر، اب میرا راز تمہیں تو معلوم ہو ہی گیا ہے، دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"خالہ جان" میں نے آہستہ سے کہا "آج رات ہم سب اندھیرے میں تھے۔ اپنے بارے میں بھی اور ایک دوسرے کے بارے میں بھی۔ ہم اپنے بارے میں ایک دوسرے کو حقیقت بتاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ اور یہی بات ہمارے لیے مصیبت اور پریشانی کا باعث بنی تھی۔ آپ کچھ دیر اور نہ آتیں تو شاید خوف سے ہم دونوں کی جان نکل جاتی۔"

"میری آدھی جان تو الماری میں بند ہونے سے ہی نکل گئی تھی" شاہین نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "کچھ دیر اور الماری کا دروازہ نہ کھلتا تو اُس کے اندر سے شاہین کی بجائے شاہین کی لاش برآمد ہوتی۔"

"حوصلہ رکھو" خالہ سعیدہ نے کہا "آؤ، نیچے چلتے ہیں۔ وہاں میں تمہارے لیے قہوہ تیار کروں گی۔ تینوں مل کر گرم گرم قہوہ پئیں گے اور پھر گرم گرم باتیں کریں گے۔"

"ٹھہریے، خالہ جان" شاہین نے کہا جو ابھی تک کپڑوں والی الماری کے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟" خالہ نے پوچھا۔

"بات یہ ہے" شاہین نے کہا "جب میں اندر سے الماری کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا تو الماری کے فرش کا ایک ڈھیلا تختہ اُکھڑ گیا تھا۔ یہ دیکھیں۔"

اور وہ تینوں موم بتی کی روشنی میں اُس جگہ کو دیکھنے لگے جہاں سے تختہ اُکھڑا تھا۔ اِس تختے کے اُکھڑ جانے سے الماری کے فرش میں بنا ہُوا ایک خفیہ خزانہ دکھائی دے رہا تھا، جس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ وہ دولت تھی جو خالو ارشد خالہ سعیدہ کے لیے چھوڑ گئے تھے! (مرکزی خیال ماخوذ)

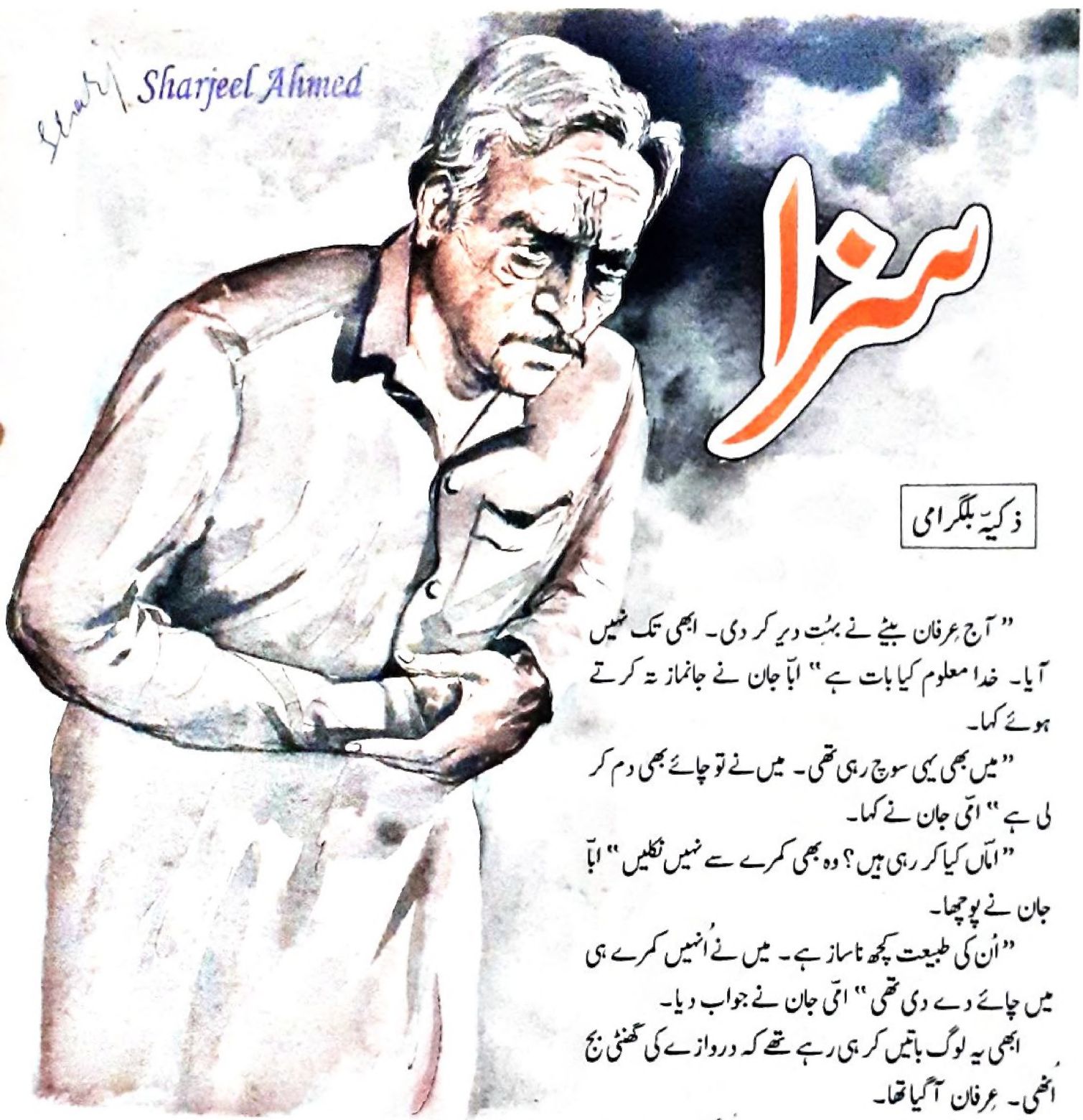

سزا

ذکیہ بلگرامی

"آج عرفان بیٹے نے بہت دیر کر دی۔ ابھی تک نہیں آیا۔ خدا معلوم کیا بات ہے" ابّا جان نے جانماز تہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ میں نے تو چائے بھی دم کر لی ہے" امّی جان نے کہا۔

"اماں کیا کر رہی ہیں؟ وہ بھی کمرے سے نہیں نکلیں" ابّا جان نے پوچھا۔

"اُن کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں نے اُنہیں کمرے ہی میں چائے دے دی تھی" امّی جان نے جواب دیا۔

ابھی یہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ عرفان آگیا تھا۔

"مُعاف کیجیے گا، ابّو جان۔ آج دیر ہو گئی۔ دراصل ہم سب سیٹھ صاحب کے گھر چلے گئے تھے، اُن کی خیریت پُوچھنے۔"

"کیوں؟ کیا ہُوا تمہارے سیٹھ صاحب کو؟"

"پتا ہی نہیں چلتا، کیا بیماری ہے۔ کافی دِنوں سے بیمار ہیں۔ فیکٹری بھی نہیں آتے۔"

"خُدا اُنہیں شِفا دے" ابّا جان نے کہا "اچھا ہوا تم عیادت کو چلے گئے۔ ہمارے پیارے نبیؐ جب کسی کی بیماری کا سُنتے تو اُس کی مزاج پُرسی کو ضرور جاتے۔"

"جی ہاں، ابّا جان۔ مجھے معلوم ہے" عرفان نے سعادت مندی سے کہا۔ اِتنے میں عرفان کی امّی چائے اور بسکٹ لے کر آگئیں۔ پھر سب باتیں کرنے لگے۔

عرفان بے حد سعادت مند لڑکا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اِکلوتا تھا۔ گھر میں دادی بھی رہتی تھیں۔ بس یہی چار لوگ تھے۔ بی کام کر کے وہ ایک فیکٹری میں مُلازِم ہو گیا تھا۔ اِن لوگوں کے مالی حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ معمولی رِہائش اور

معمولی درجے کا کھانا پینا۔ مگر صبر و شکر، خوشی اور اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔

عرفان کے والد صابر صاحب اور والدہ شاکرہ نے اپنے بیٹے کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ دادی کی محبت اور شفقت بھی ہمیشہ اُس کے ساتھ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک سعادت مند اور بزرگوں کی عزت کرنے والا لڑکا تھا۔ اُسے اپنے ماں باپ اور دادی سے بہت محبت تھی۔ وہ دُنیا کے ہر انسان کا احترام کرتا تھا، مگر ماں کی محبت اور دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا کہ یہی صابر صاحب کی تعلیم تھی۔

ابھی عرفان کی ملازمت کو صرف ایک سال ہی ہُوا تھا۔ کبھی کبھار وہ فیکٹری کے مالک سیٹھ اجمل کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ اُن دِنوں وہ بہت زیادہ بیمار تھے۔ وہ کیا بیمار تھے؟ اِس سوال کا کوئی جواب عرفان کے پاس نہ تھا۔ چند دن گزرے تھے کہ اُس نے آکر بتایا:

"ابّا جان، سیٹھ صاحب کو عجیب و غریب قسم کی بیماری ہے، جسے ڈاکٹر سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

"کیا بیماری ہے اُنہیں؟ یہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہُوں۔"

"اُن کے تمام ٹیسٹ ہوئے، ایکس رے بھی ہوئے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ بس پیٹ میں درد اُٹھتا ہے، ایسا شدید کہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ نہ کچھ کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اِس درد کی وجہ کیا ہے۔ بس وہ نیند کا اِنجکشن لگا دیتے ہیں۔"

"ارے! یہ تو بڑی عجیب بیماری ہے!" امّی نے کہا۔

"جی ہاں، امّی۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اِس لیے کہ ایکس رے بالکل صاف ہیں۔"

"اُن کے بیوی بچے تو بہت پریشان ہوں گے" امّی نے پُوچھا۔

"اُن کا کوئی نہیں ہے۔"

"ارے! وہ کیوں؟"

"یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی۔ اُنہوں نے شادی کی تھی لیکن بیوی کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا۔ اولاد بھی کوئی نہیں ہے۔ دولت ہے مگر زندگی کا سُکھ نہیں ہے اور اب صحت بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔"

"سُن رہے ہیں، آپ؟ عرفان کیا بتا رہا ہے، سیٹھ صاحب کے مُتعلّق؟" شاکرہ بیگم نے شوہر سے کہا۔

"ہاں، ہاں۔ سب سُن رہا ہوں۔"

"تو پھر آپ اپنا علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"اپنا علاج سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" عرفان نے تعجّب سے پوچھا۔

"بیٹا، تمہارے ابّو کے پاس ایک بخشی ہوئی دُعا ہے۔ کسی قسم کا درد ہو، وہ دُعا پڑھ کر پھونک دینے سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"سچ، ابّا جان؟" عرفان نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں، بیٹے۔ یہ دُعا ایک بزرگ نے مجھے بخشی تھی۔ کئی بار آزما چکا ہوں۔ اللہ کا کرم ہمیشہ شامل رہتا ہے اور مریض کو افاقہ ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر ابّا جان، آپ کل ہی چلیں میرے ساتھ۔"

"ضرور چلوں گا۔" صابر صاحب نے رضامندی دے دی۔

"دوسرے روز صابر صاحب عرفان کے ساتھ سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹے تھے اور اُن کے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اُس وقت انجکشن کے اثر سے سو رہے تھے۔ ملازموں نے بتایا کہ آج تکلیف زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب ابھی انجکشن دے کر گئے ہیں۔

"ابّا جان، آپ دُعا کریں، ان کے لیے" عرفان نے بے تابی سے کہا۔

صابر صاحب سیٹھ اجمل کے قریب گئے تاکہ پیٹ کے اُوپر ہاتھ رکھ کر دُعا پڑھیں کہ چہرے پر نظر پڑی۔ وہ چونک پڑے اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بولے "چلو، بیٹے، چلو، گھر واپس چلو۔ یہ بیماری نہیں، سزا ہے۔ اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔"

عرفان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ صابر صاحب نے بھی کوئی بات نہیں بتائی۔ دونوں گھر واپس آ گئے۔

"ابّو کچھ تو بتایئے؟ آپ کی بات کا مطلب کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا" عرفان نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ بتایئے نا، قصّہ کیا ہے؟" شاکرہ بیگم نے کہا۔

صابر صاحب کچھ دیر سر پکڑے خاموش بیٹھے رہے، پھر آہستہ سے بولے "میں اِس شخص کو جانتا ہُوں۔"

"آپ؟"

"ہاں، بیٹے۔ سُنو۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اجمل میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ پھر بھی دوست تھے۔ اِس لیے کہ ہم دونوں ہی غریب گھرانوں سے تعلّق رکھتے تھے۔ میرے اکثر اُستاد کہتے تھے کہ اجمل سے

دوستی نہ کروں۔ اِس کی عادتیں اچھی نہیں ہیں۔ مگر میں نے اُن کی ایک نہ سُنی۔

"اجمل بُرا تھا مگر اُس کی ماں بہت اچھی تھیں۔ بے حد عبادت گزار اور محبت کرنے والی خاتون۔ مجھے بے حد چاہتی تھیں۔ اِسی وجہ سے میں اُن کے گھر روزانہ شام کو پابندی سے جایا کرتا تھا۔ وہ بیوہ تھیں۔ لیکن اجمل کو اُن کا خیال نہ تھا۔ وہ اِسکول سے واپس آ کر باہر کھیلنے نکل جاتا۔ وہ بے چاری تنہا رہتی تھیں۔ اُن کی تنہائی کے خیال سے میں روزانہ شام کا کچھ وقت اُن کے پاس گزارتا تھا اور اُن کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے ہزاروں دُعائیں دیتی تھیں۔"

"مگر ابّا جان، سیٹھ صاحب کی بیماری سے اِن باتوں کا کیا تعلّق ہے؟"

"خاموشی سے سُنو۔ سب کچھ سمجھ جاؤ گے" صابر صاحب نے کہا "ایک روز میں حسبِ معمول اجمل کے گھر گیا تو اجمل بھی گھر میں موجود تھا۔ اماں کی طبیعت کچھ بوجھل تھی۔ میں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اجمل باہر جانے لگا تو اماں نے کہا "اجمل، بیٹا، مجھے بھوک لگی ہے۔ بازار سے بسکٹ لے آؤ۔ میں نے چائے بنالی ہے۔"

"میں جا رہا ہوں، ایک کام سے۔ نہیں لاؤں گا بسکٹ وسکٹ" اُس نے اِتنی بدتمیزی سے کہا کہ میں حیران رہ گیا۔

"اجمل، رُک جاؤ۔ یہ لو پیسے۔ بسکٹ لے آؤ" اماں نے لیٹے لیٹے کہا "میں بہت بھوکی ہوں۔"

اچانک اجمل کو نہ جانے کیا ہُوا، اُس درندے نے قریب پڑا ہُوا بڑا سا پتھر اُٹھا کر اماں کے پیٹ پر رکھ دیا اور بولا "لو! اب نہیں لگے گی بھوک" اور یہ کہہ کر چیزوں کو ٹھوکریں مارتا ہُوا گھر سے نکل گیا۔

میں نے جلدی سے پتھر اُٹھا کر باہر پھینکا۔ اماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اُنہوں نے کہا "اجمل، تو نے ماں کا دِل دُکھایا ہے۔ اچھا نہیں کیا۔ تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

صابر صاحب اِتنا کہہ کر رُک گئے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"پھر کیا ہُوا، ابّو؟" عرفان بھی غم زدہ تھا۔

"اجمل پھر کبھی لَوٹ کر نہ آیا۔ اماں اکیلی رہ گئیں۔ میں اُنہیں اپنی ماں کے پاس لے آیا۔ ماں جی نے اُنہیں بہنوں کی طرح رکھا۔ یہ تمہارا سیٹھ اجمل وُہی اجمل ہے۔ میں فوری طور پر اُسے پہچان نہ سکا تھا۔ مگر پھر پہچان گیا۔ اور بیٹا، یہ جو اُس کا حال ہے، اُس کے اعمال کی سزا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے پیٹ میں اُسی جگہ درد اُٹھتا ہے جس جگہ اُس نے ماں کے پیٹ پر پتھر رکھا تھا۔ تو بس بیٹا، میں لَوٹ آیا کہ میرے پاس اِس کی بیماری کا علاج نہیں ہے۔ یہ بیماری نہیں، سزا ہے جو اُسے خدا کی طرف سے مِل رہی ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول ؐ نے تو ماں کا درجہ بہت بلند کیا ہے۔ مگر یہ ناسمجھ کیا جانے اِن باتوں کو۔ گھر سے نکل کر بُرے لوگوں کی صُحبت میں پڑ گیا۔ پھر سُنا کہ غلط سلط طریقوں سے خوب روپیہ کمایا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ کہاں ہے، کیا کر رہا ہے۔ آج پتا چلا"۔

"توبہ ہے! کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں، دُنیا میں۔" شاکرہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ عرفان بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو، بیٹے؟" باپ نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں، ابّا جان۔ افسوس کر رہا ہوں یہ واقعہ سُن کر۔ اور ہاں، آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ پھر سیٹھ صاحب کی اماں کب تک زندہ رہیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ معلوم ہُوا یا نہیں؟"

"وہ یہ جانتی ہیں کہ اُن کا بیٹا غلط باتوں میں پڑ گیا تھا۔ وہ زندہ ہیں۔"

"زندہ ہیں؟ مگر کہاں ہیں؟"

یہیں، ہمارے گھر میں — یہ تمہاری دادی اماں جن سے تم اِتنا پیار کرتے ہو، اور جو تمہیں اور ہم سب کو اِس قدر چاہتی ہیں، وُہی تو ہیں۔ تمہاری دادی تو مدّت ہوئی انتقال کر گئی تھیں۔ "

"یہ بات تو مجھے بھی معلوم نہ تھی" شاکرہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، میں نے مُناسِب نہ سمجھا، اِس لیے کہ اماں مجھے بہُت چاہتی ہیں، اور میں نے کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہ کی۔ "

"واقعی، یہ تو عجیب باتیں ہیں۔ مگر اب کیا کیا جائے؟" شاکرہ بیگم نے کہا۔

"اب تو اجمل کے اچھے ہونے کی صِرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ ماں سے معافی مانگے اور ماں اُسے دِل سے مُعاف کر دیں" صابر صاحِب نے کہا۔

صابر صاحِب نے فی الحال اماں کو کُچھ بتانا مُناسِب نہ سمجھا اور دوسرے روز وہ اجمل سے اُس وقت ملے جب وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے صابر صاحِب کو پہچان لیا اور بولا "صابر، تم ویسے ہی ہو۔ بالکُل نہیں بدلے۔ میں تمہیں بہُت یاد کرتا تھا۔ شاید تم میری ماں کا پتا بتا سکو۔ "

"کیا کرو گے ماں کا پتا لے کر؟" صابر صاحِب نے تلخی سے کہا۔

"میں بہُت گُناہ گار ہوں۔ میں نے ماں کو دُکھ دیا تھا۔ اُسی کی سزا بھُگت رہا ہوں۔ لگتا ہے، پیٹ پر بڑا سا پتّھر رکھا ہے۔ درد برداشت سے باہر ہے۔ جو بویا تھا، وُہی کاٹ رہا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں، مگر گُناہ بہُت بڑا ہے۔ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اگر ماں مجھے مُعاف کر دے تو شاید میری مشکل آسان ہو جائے۔ "

صابر صاحِب نے اجمل کو تسلّی دی اور ماں کے مُتعلِّق بتا کر کہا "میں اماں کو مناؤں گا۔ وہ تمہیں مُعاف کر دیں گی۔ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ "

"تم بہُت عظیم ہو صابر، اور خوش نصیب بھی۔ میں بدنصیب بھی ہوں اور کم ظرف بھی۔ "

یہ کہ کر سیٹھ اجمل رونے لگا۔ پھر اچانک اُس کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا اور وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُسی وقت ڈاکٹر کو فون کیا گیا اور اُس نے آ کر سُکون کا اِنجکشن لگایا۔

صابر صاحِب نے اجمل کی ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ اُن کا نُورانی چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ سکتے میں رہ گئیں۔ صابر صاحِب نے کہا "اماں، آپ اجمل کو مُعاف کر دیجیے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ "

"میں مُعاف کر دوں اُس کو، جس نے ماں کے رُتبے کو نہ جانا؟ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی؟ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ ماں باپ کو اُف تک نہ کہو۔ اُن کے سامنے عاجزی سے اپنے شانے جُھکائے رکھو۔ اور اُس نے تو، اُس نے تو....." اتنا کہ کر اماں رونے لگیں۔

اماں نے اجمل کو مُعاف نہیں کیا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ اجمل کی حالت خراب سے خراب ہوتی گئی۔ اور اب یہ حال تھا کہ نہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں۔ تب صابر صاحِب اور عِرفان نے اماں کی خوشامد کی۔ اُن کا دل موم ہو گیا۔ اُنھوں نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے اور بولیں:

"میں نے اجمل کو مُعاف کیا، مُعاف کیا، مُعاف کیا۔ اے اللہ! تو اُسے اپنی پناہ میں لے لے۔" یہ کہ کر رونے لگی۔

صابر صاحِب اور عِرفان بھاگم بھاگ سیٹھ اجمل کے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ اماں کی دُعا عرش پر پہنچ گئی تھی اور سیٹھ کی مُشکل آسان ہو گئی!

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

بزدل چیتا بہادر شکاری

Sharjeel Ahmed

جب میں خان صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں حسب معمول مجمع لگا ہُوا تھا۔ خان صاحب بہت خوش مزاج، مہمان نواز اور یار باش آدمی تھے۔ اور ہمارے ابّا کے دوست تھے۔ اُن کے گھر روزانہ شام کو بے فکروں کی محفل جمتی، خوش گپیاں ہوتیں بلکہ بعض اوقات تو صرف گپیں ہی ہوتیں۔ خاص طور پر جس دن خان صاحب کے شکاری دوست سیٹھ افریقہ والا آتے اُس دن تو بڑے دلچسپ اور ناقابل یقین واقعات سُننے کو ملتے۔ اُس دن بھی سیٹھ افریقہ والا آئے ہوئے تھے اور افریقہ میں اپنے شکار کے واقعات سُنا رہے تھے۔ وہ دراصل افریقہ میں خاصا عرصہ رہے تھے اور وہاں اُن کا کاروبار تھا۔ اِس لیے اُن کا نام سیٹھ افریقہ والا پڑ گیا تھا۔ میں خان صاحب کے گھر پہنچ کر ایک کونے میں دبک گیا جہاں دوسرے بچّے اور میرے دوست ٹلّو میاں پہلے ہی موجود تھے۔

جب میں خان صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سیٹھ افریقہ والا کہہ رہے تھے "بس جناب، میرا درخت سے کُودنا غضب ہو گیا۔ وہ خُوں خوار چیتا قریب ہی جھاڑیوں میں چھُپا ہوا تھا۔ میرے کُودتے ہی جھاڑیوں سے نکلا اور مجھ پر حملہ کرنے کو ہی تھا کہ میں سر پر پیر رکھ بھاگ کھڑا ہُوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ وہ مُوذی چند ہی لمحوں میں مجھے آ لیتا کہ مجھے ایک ترکیب سُوجھی۔

"جنگل میں افریقہ کے لوگوں نے جانوروں کو پکڑنے کے لیے گڑھے کھود رکھے تھے اور اُن پر درختوں کی شاخیں اور پتّے وغیرہ ڈال کر اُنہیں چھُپا دیا تھا تاکہ جانور اُن پر پاؤں رکھیں تو گڑھے میں جا گریں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے ایک گڑھے پر سے شاخیں اور پتّے ہٹائے اور اللہ کا نام لے کر غڑاپ سے اندر کُود گیا۔ میرا خیال تھا کہ چیتا میرا پیچھا کرتا ہوا اُس چھ فُٹ گہرے گڑھے میں تو کُودنے سے رہا۔ لیکن صاحب، یہ دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے کہ چیتا گڑھے کے کنارے پر کھڑا مجھے خونی نظروں سے گھور رہا ہے۔ اور پھر آن کی آن میں اُس نے گڑھے میں چھلانگ لگا

دی۔ اگر میں پہلو بدل کر ایک طرف جُھکائی نہ دے دیتا تو وہ ظالم سیدھا میرے اُوپر ہی گرتا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دہشت ہی سے اُس کا دم نکل جاتا لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ میری پوری زندگی افریقہ کے خوف ناک جنگلوں میں درندوں سے دو دو ہاتھ کرتے گزری ہے۔ میں ذرا نہ گھبرایا۔ "

سیٹھ افریقہ والا کا بیان لوگ بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ لیکن جب اُنھوں نے کچھ زیادہ ہی ڈینگیں مارنا شروع کیں تو کچھ لوگ مسکرائے بھی۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں بے خبر کہتے گئے "بس جناب، اُسی وقت میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی کہ کچھ دیر کے لیے تو خود میں بھی حیران رہ گیا۔ جانور آگ سے بہت ڈرتے ہیں میں نے سوچا کیوں نہ اِسے بھی آگ سے ڈرایا جائے۔ میں نے فوراً جیب سے سگرٹ لائٹر نکال کر جلایا۔ چیتا مجھ پر چھلانگ لگانے والا ہی تھا کہ سگرٹ لائٹر کا شُعلہ بھڑکا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اب تو میں بھی شیر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لائٹر کے شُعلے سے اُس کی داہنی مُونچھ کے بال جلانا شروع کر دیے۔ چیتا اُچھل کر پیچھے ہٹا اور بڑی دردناک آواز میں دہاڑا۔

"اُف وہ دہاڑ! خدا کی پناہ! کم زور دل والے تو اُس دہاڑ کو سُنتے ہی فوت ہو جاتے۔ لیکن میں نے ایک بھرپُور قہقہہ لگایا اور پھر ہاتھ آگے بڑھایا کہ اُس کی بائیں مُونچھ بھی جلا دُوں۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے مجھے چھوڑ کر اُوپر چھلانگ لگائی اور گڑھے سے باہر نکلنے کو ہی تھا کہ میں نے لپک کر اُس کی دُم پکڑ لی۔ اب اُس کے اگلے دو پاؤں گڑھے کے کنارے پر ہیں، پچھلے دو گڑھے کے اندر اور میں پیچھے سے اُس کی دُم مروڑ رہا ہوں۔ ذرا سوچیے کہ کیا منظر ہو گا۔" سیٹھ افریقہ والا نے کہا اور اپنے برابر بیٹھے ہوئے ملک صاحب کی پیٹھ پر زور سے ایک ہاتھ رسید کیا۔ ملک صاحب ڈر کے مارے چونکے۔ سب نے قہقہہ لگایا جس میں سب سے بلند قہقہہ سیٹھ افریقہ والا کا تھا۔

خان صاحب کی نظریں تو اپنے دوست سیٹھ افریقہ والا پر تھیں لیکن اُن کا ہاتھ مُونچھ مروڑ رہا تھا، اور ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دراصل اُنھوں نے اِسی مسکراہٹ کو چُھپانے کے لیے مونچھوں کو تاؤ دینے کے بہانے چہرے کے آگے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُنھیں اپنے دوست کی باتوں پر ذرّہ برابر یقین نہیں آ رہا۔ کچھ اور لوگ بھی بے یقینی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ البتہ بچّے سہمے ہوئے تھے۔ خود میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ لیکن ٹلّو میاں کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

"لیکن میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ آج اس بُزدِل چیتے کو چھوڑنا نہیں ہے" سیٹھ صاحب نے کہنا شروع کیا "کم بخت کی وجہ سے مجھے گڑھے میں گرنا پڑا تھا۔ میں نے اِرادہ کر لیا تھا کہ اب اِسی کے سہارے باہر نکلوں گا۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں اُس کی دُم نہیں چھوڑ رہا تو وہ گڑھے کا کنارہ چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بڑی بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگا جیسے کہ رہا ہو کہ پلیز، مجھے جانے دو۔ لیکن میں نے سگرٹ لائٹر آگے کر دیا۔ یہ اِشارہ تھا اِس بات کا کہ باہر نکلیں گے تو دونوں، ورنہ تمھیں یہیں جلا کر خاک کر دوں گا۔ وہ میرا اِشارہ سمجھ گیا۔ اگلی دفعہ جب اُس نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی تو میں اُس کی دُم پکڑ کر لٹک گیا۔ وہ زور لگاتا رہا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ایک ایک اِنچ کھسکتا ہُوا تھوڑا باہر نکل گیا۔ میں اُس کی دُم سے چمٹا ہوا تھا۔

"خیر، صاحب۔ گڑھے سے باہر نکلتے ہی میں نے اُس کی دُم چھوڑ دی اور وہ دُم دبا کر بھاگ گیا۔ سوچتا ہو گا کہ یہ کون سی بلا گلے پڑ گئی۔ بُزدل! گیدڑ کہیں کا!"

ابھی افریقہ والا صاحب نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ اُن کی گود میں ایک مُردہ چُوہا آ کر گرا۔ اُنھوں نے ایک ہَول ناک چیخ ماری اور اُچھل کر صوفے پر کھڑے ہو گئے۔ چُوہا بھی اُن کے اُچھلنے سے اُچھلا اور میز پر جا گرا۔ افریقہ والا نے ایک اور چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ اُن کو ہوش میں لانے کے لیے لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑی۔ اِس کے بعد ٹلّو میاں کی ڈھنڈیا پڑی۔ لیکن وہ بھلا وہاں کہاں ملتے۔ آخر اُنھیں چوہے والے ہاتھ بھی تو دھونے تھے!

یتیم بچّوں کے حقوق

Sharjeel Ahmed

ڈاکٹر عبدالرؤف

اِس شُمارے میں بچّوں کے لیے سِلسِلہ وار درسِ قُرآن کا موضوع ہے "یتیم بچّوں کے حقوق۔"

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (سو یتیم کو مت دباؤ)

فَاَمَّا کا مطلب ہے: سو، لہٰذا، پس۔ یتیم کے عربی اور اُردو میں ایک ہی معنی ہیں۔ لا کا معنی ہے: نہ، نہیں۔ تَقْهَرْ کا مطلب ہے: دبانا، سختی کرنا، وغیرہ۔

اِس مُختصر سی آیتِ مبارکہ کا پورا لفظی ترجمہ یہ ہوا "سو یتیم پر سختی نہ کرو!" یہ پارہ نمبر 30 کی مکّی سورت نمبر 93 (الضّحیٰ) کی آیت نمبر 9 ہے۔

اِسلام میں یتیم بچّوں کی خصوصی دیکھ بھال اور اُن سے شفقت و محبّت پر بہُت زور دیا گیا ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمّد صلّی اللہ عَلَیہِ وَسلّم دنیا بھر میں یتیموں اور ناداروں کے حقوق کے سب سے بڑے پاسبان مانے جاتے ہیں۔ یتیموں سے شفقت کا صحیح اِسلامی طریق یہ ہے کہ اُن کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے لیے ہر ممکن عملی اِقدام کیے جائیں۔ اُن پر اپنے بچّوں اور بہن بھائیوں، بلکہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر، توجّہ دی جائے۔ ہر بچّے کو چاہیئے کہ وہ تھوڑا بہُت وقت نکال کر کسی نہ کسی یتیم خانے یا ایس او ایس اِدارے میں اپنا آنا جانا ضرور رکھے۔ یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت میں حصّہ لینا ہم سب کا خوشگوار فرض ہے۔ ہمارے تعاون اور توجہ سے یتیموں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نیک کام میں شمولیت سے ہماری اپنی شخصیت اور کردار کو سدھرنے کے بھی بے مثال مواقع میسّر آتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں یتیم بچّوں کے حقوق کے اِحترام اور اُن کی فلاح و بہبود کے بارے میں کئی اور جگہوں پر بھی پُرزور تلقین ہوئی ہے۔ یتیموں کی دیکھ بھال سے متعلّق قرآنِ مجید میں بتائی ہوئی مزید معلومات اور ہدایات کے لیے آپ اِن آیتوں کا مُطالعہ بھی کر سکتے ہیں:

سُورت 2، آیات 215,83 اور 220 - سُورت 4، آیات 36,10,6,2 اور 127 - سُورت 17، آیت 34 -

Sharjeel Ahmed

دانائی کی باتیں

سُنہری چڑیا

محبّت کرنا سیکھو

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو! میں آج آپ کو ایک ایسی دانائی کی بات بتانا چاہتی ہوں جو دُنیا جہان کے مال و دولت سے کہیں زیادہ قیمتی، بلکہ اَن مول ہے۔

جانتے ہو وہ چیز کیا ہے؟ لو، میں بتاتی ہوں۔ غور سے سُننا اور اِس پر عمل کرنا۔ وہ چیز ہے:

محبّت کرنا سیکھو

محبّت کے لفظ میں دونوں جہانوں کی سچّی خوشیاں اور کام یابیاں پوشیدہ ہیں۔ اگر تم عظیم، کام یاب اور صالح انسان بننا، اور پاکیزہ اور خوشیوں بھری زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو

محبّت کرنا سیکھو

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے "اپنے آپ سے محبّت کرو۔" آپ یہ سُن کر سوچیں گے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ ہر شخص اپنے آپ سے محبّت کرتا ہے۔

لیکن پیارے بچّو، حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص نہیں، بلکہ خال خال آدمی اپنے آپ سے محبّت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو بچّے سچّے طالبِ علم نہیں، علم حاصل کرنے کے لیے ذوق و شوق سے محنت نہیں کرتے، بلکہ لکھنے پڑھنے سے جی چُراتے ہیں، اِس طرح علم کی روشنی سے محروم ہو کر اندھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچّے اپنے آپ سے محبّت کرتے ہیں یا دُشمنی؟ آپ کا جواب یقیناً یہ ہو گا کہ ایسے اَن پڑھ اور دل کے اندھے بچّے اپنے دُشمن ہوتے ہیں۔ وہ نہ ترقّی کر سکتے ہیں اور نہ بڑے آدمی ہی بن سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اللہ میاں کی سب سے بڑی نعمت قرآنِ مجید کی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

بخلاف اِس کے، اپنے آپ سے محبّت کرنے والے بچّے وہ ہیں جو دل و جان سے علم حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ پھر علم و ہُنر سیکھ کر عالِم و فاضِل بن جاتے ہیں۔ سچّے طالبِ علم عُمر بھر علم و ہُنر میں کمال حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے ماں باپ اور ملک و قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔ یہی علم و ہُنر کی دولت میں اِضافہ اور اِنسان سے اِحسان کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآنِ مجید سے رُشد و ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اپنے آپ سے محبّت کرنے والوں کی دوسری مثال اُن لوگوں کی ہے جو سچّی یا نیک زندگی بسر کرتے ہیں۔ دُکان دار ہیں تو دیانت داری سے کاروبار کرتے ہیں، نہ کم تولتے ہیں نہ کم ناپتے ہیں، چیزوں میں مِلاوٹ نہیں کرتے، گاہکوں کو دھوکا نہیں دیتے، وعدہ کر کے مُکر نہیں جاتے۔ جو کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔

ایسے دیانت دار لوگ ہی اپنے آپ سے محبّت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دُنیا میں سچّی خوشی ملتی ہے اور آخرت میں بھی وہ جنّت میں خوش خوش رہیں گے۔ آخرت میں موت نہیں ہوگی، اِس لیے، وہ جنّت میں ہمیشہ زندگی بسر کریں گے۔

وہاں وہ اللہ میاں کے مہمان ہوں گے۔ اُنہیں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی۔ اُن سے اللہ میاں باتیں کرے گا اور اپنی صورت بھی دکھائے گا۔

بخلاف اِس کے، جن لوگوں کو اپنے آپ سے محبّت نہیں ہوتی وہ دوزخ میں جائیں گے، جہاں وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ عذاب بھی آگ کا ہو گا، اور اِس قدر شدید ہو گا کہ وہ زندوں میں ہوں گے نہ مُردوں میں۔

پیارے بچّو!

آپ جاننا چاہیں گے کہ ایسے لوگ کون ہیں؟ ایسے ظالم و جاہل لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں صرف اُن کی چند ایک قسموں کی نشان دہی کروں گی۔ ایسے ظالم و جاہل لوگوں کی ایک قسم حرام خوروں کی ہے۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو رِشوت لیتے ہیں۔ رِشوت کا پیسہ آگ ہے، جس سے وہ اپنا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اُن کو کبھی سچّی خوشی نصیب نہیں ہوتی، بلکہ اُن کے دل خوف اور غم کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہوتے ہیں۔

حرام خوروں کی ایک قسم اُن ظالم لوگوں کی ہے، جو جیب تراش، چور اور ڈاکو ہیں۔ وہ بھی جو نشے کی چیزیں بیچتے ہیں اور نشہ کرتے ہیں۔ جُوا کھیلنے والے، نوسرباز اور لُٹیرے بھی حرام خور ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹے پیر، فقیر اور ملنگ بھی جو دغا و فریب سے بھولے بھالے لوگوں کو لُوٹ لیتے ہیں۔ ضمیر فروش، قوم فروش اور وطن فروش لوگ بھی حرام خور اور جہنّمی ہوتے ہیں۔ سُود خور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مقبولؐ کے دُشمن اور حرام خور ہیں۔ یہ بھی ہمیشہ دوزخ میں جلتے رہیں گے۔

الغرض، قرآنِ حکیم کی زبان میں تمام مُجرم و گُناہ گار، نیز فرعون، ہامان، قارون، اور آزر اللہ تعالیٰ کے دین اور بندوں کے دشمن، حرام خور اور دوزخی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اُس کی آخری کتاب قرآنِ مجید کو سوچ سمجھ کر نہیں پڑھتے، اُس سے روشنی حاصل نہیں کرتے، ان کے دل بے نور رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ قیامت کے روز جب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے تو "اندھے" اُٹھیں گے۔ اِن اندھوں کو تمام گُناہ گاروں اور مُجرموں کے ساتھ دوزخ میں پھینکا جائے گا۔ دوزخ میں وہ درد سے روئیں گے، فریاد کریں گے لیکن اُن کی چیخ پُکار کوئی نہیں سُنے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اپنے آپ سے محبّت نہیں تھی۔ اِس لیے اُن سے کوئی محبّت نہیں کرے گا۔

پیارے بچّو! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ

اللہ میاں اُن لوگوں سے محبّت کرتا ہے جو اپنے آپ سے محبّت کرتے ہیں۔

اِس بات پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنے آپ سے سچّی محبّت ہوتی ہے، اُن کو اپنے رب اور اُس کے بندوں سے بھی محبّت ہوتی ہے۔ یہ محبّت اُن کو نیک بناتی ہے۔ وہ دوسروں کو ستاتے ہیں نہ دُکھ ہی دیتے ہیں، بلکہ اُن کے کام آتے ہیں، اُن کی مدد اور اُن سے اِحسان کرتے ہیں۔ وہ بخیل نہیں، سخی ہوتے ہیں، بے ایمان نہیں، ایمان دار ہوتے ہیں۔ وہ قوم و ملک سے غدّاری نہیں کرتے، بلکہ اُن کی آزادی کی خاطر اپنا مال و جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ خود بھی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور لوگوں میں بھی تعلیم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ بیماروں کے لیے ہسپتال بناتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے قرآنِ مجید کی تعلیمات اور احکام کی تبلیغ کرتے ہیں۔

پیارے بچّو! آخر میں آپ کو ایک اور دانائی کی بات بتاتی ہُوں جو دِین کی رُوح ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

اللہ میاں کی سب مخلوقات سے محبّت کرو، لیکن سب سے زیادہ محبّت اپنے خالق، رازق اور پروردگار سے کرو۔

میرزا ادیب

اندھیری رات میں ایک بوڑھا

Sharjeel Ahmed

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دو دن پہلے خوب مُوسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ گڑھوں اور نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہو گیا تھا۔ لوگوں کو آنے جانے میں دِقّت ہو رہی تھی۔ پھر آسمان صاف ہو گیا اور سڑکوں، بازاروں کی رونق واپس آ گئی۔

راشد اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے ابّو کا انتظار کر رہا تھا۔ ابّو نے کہا تھا کہ میں شام سے پہلے گھر آ جاؤں گا اور تمہیں گاڑی میں تمہارے دوست کے ہاں پہنچا دوں گا۔ اُس کے دوست نے کلاس کے لڑکوں کی دعوت کی تھی۔ شام ہو گئی تھی اور اُس کے ابّو ابھی تک نہیں آئے تھے۔

آدھ گھنٹا اور بیت گیا۔ راشد کچھ بے تاب ہو گیا۔ اُسے اپنے دوست کے ہاں جانے کی جلدی تھی کیوں کہ دعوت کے بعد بڑا دل چسپ پروگرام ہونے والا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے کئی دوستوں سے مُلاقات ہونے کی بھی توقّع تھی۔

یکایک اُس کے کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔

"ایں! یہ کیا؟" اُس کے دل میں سوال اُبھرا۔ کمرے کا بلب جل رہا تھا۔ پھر یہ اندھیرا کہاں سے آ گیا؟ اُس نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آسمان پر سیاہ بادل اُمنڈ رہے تھے۔

"یا اللہ! بارش نہ ہو" اُس نے کھڑکی سے ہٹ کر کُرسی پر بیٹھتے ہوئے دُعا مانگی۔ اپنی چھوٹی بہن عارفہ سے اُس نے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی ابّو آئیں، فوراً بتا دینا۔ اور عارفہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"بارش ہونے لگی تو کیا ہو گا؟" راشد نے خود سے سوال کیا۔ اور پھر خود ہی جواب دیا "فکر کی کیا بات ہے۔ ابّو گاڑی میں چھوڑ آئیں گے۔"

وہ کُرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ خود اُس

کمرے میں گیا جہاں گھر والے کھانا کھانے سے پہلے بیٹھا کرتے تھے۔

"ابّو نہیں آئے امّی؟" اُس نے ماں سے پوچھا۔

"بیٹا، آ گئے ہوتے تو تمہیں عارفہ نہ بتا دیتی؟ اِنتظار کرو۔ آنے والے ہی ہوں گے۔" ماں کے یہ الفاظ سُن کر راشد اُسی تیزی سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا جس تیزی سے گیا تھا۔

وقت گزاری کے لیے اُس نے میز کے اُوپر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں ترتیب سے رکھا، شیشے کے سامنے جا کر اپنے لباس پر نظر ڈالی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔

اُسے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ میز کی درازیں کھول کر اُن میں رکھی ہوئی چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے کے بعد اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ بغیر کسی مقصد کے اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا ایسی ہی بارش ہو گی جیسی دو دِن پہلے ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے نظر ہٹانے ہی والا تھا کہ اُس نے اپنے گھر کے قریب ایک سایہ سا دیکھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" اور یہ سوچتے ہُوئے اُس نے اپنا مُنہ کھڑکی سے باہر نکالا اور غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اچانک بجلی چمکی اور اُسے سامنے ایک شخص دکھائی دیا۔ وہ اُس شخص کو پوری طرح دیکھ نہیں سکتا تھا مگر یہ جان چُکا تھا کہ باہر کوئی کھڑا ضرور ہے۔

اُس نے میز کی سب سے نچلی دراز کھول کر ٹارچ نکالی اور اُسے ہاتھ میں لے کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا مگر ٹارچ کی روشنی میں اُسے ایک ایسا بُوڑھا نظر آیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک جگہ جیسے جم کر کھڑا تھا۔

"معلوم تو کروں یہ کون ہے۔ ممکن ہے اِسے میری مدد کی ضرورت ہو۔"

پہلے تو وہ کچھ ڈرا، لیکن جب دوبارہ اُسے دیکھا تو اُس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ ٹارچ لیے کمرے کے اُس دروازے پر آ گیا جو باہر سڑک پر کھُلتا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اب وہ بوڑھے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے، بابا جی؟" اُس نے بوڑھے کی لاٹھی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون؟" بوڑھے کی آواز آئی۔

"آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟" راشد نے پوچھا۔

بوڑھے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جیسے راشد کو چھُونا چاہتا ہے۔ راشد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بوڑھے نے جیسے اپنے آپ سے کہا "کوئی لڑکا ہے۔"

"جی، بابا جی۔"

بوڑھے نے راشد کا ہاتھ ذرا دبایا اور کہنے لگا "بیٹے، میں گھر سے نکلا تھا تو موسم بالکل صاف تھا۔ لیکن یہاں تک آتے آتے بادلوں نے اندھیرا کر دیا۔ ضعیف آدمی ہُوں۔ نظر کم زور ہے۔ نہ آگے جا سکتا ہُوں، نہ پیچھے" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"بابا جی، کہاں ہے آپ کے بیٹے کا گھر؟"

"وہ جو پُرانی مسجد ہے، اُسی کے پاس ہے۔"

"میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تکلیف تو ہو گی تمہیں۔"

"کوئی بات نہیں، بابا۔ پُرانی مسجد زیادہ دُور نہیں ہے۔ چھوڑ آؤں گا آپ کو۔"

راشد نے یہ الفاظ کہے تو بوڑھا اُسے دُعائیں دینے لگا۔ راشد بولا "بابا جی، آپ ذرا ٹھہریں۔ چھاتا لے آؤں گھر سے۔ ایک منٹ میں آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر گیا۔ ماں نے اُس کے ہاتھ میں چھاتا دیکھا تو سمجھیں کہ وہ خود اپنے دوست کے گھر جانا چاہتا ہے۔ کہنے لگیں "بیٹا، صبر کرو۔ بس ابّو آنے ہی والے ہیں۔ بیٹھو آرام سے۔ موسم خراب ہے۔"

راشد نے ماں کو بتایا "امّی، باہر ایک بوڑھا کھڑا ہے۔ قریب ہی اُس کے بیٹے کا گھر ہے۔ وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ میں

اُسے وہاں پہنچا دوں گا۔"

"بوڑھا ہے تو گھر سے اکیلا کیوں نکلا؟"

"ابھی واپس آ جاؤں گا، امّی" اور راشد تیزی سے نکل گیا۔

بوڑھا وہیں کھڑا تھا۔ راشد نے کہا "بابا، میں آ گیا ہوں۔" بوڑھے نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور راشد اُس کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اب بارش بھی ہونے لگی تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ راشد نے چھتری سے بوڑھے کو پانی سے بچانے کی کوشش کی تو خود بھیگنے لگا۔

"بیٹے، تم بھیگ رہے ہو گے؟" بوڑھے نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، بابا۔ واپس آ کر کپڑے بدل لوں گا۔"

اِس دوران میں دو تین باتیں ہی ہوئیں۔ بوڑھے نے اُس کا نام پوچھا اور اُس نے اپنا نام بتا دیا۔

ہر طرف گھرا اندھیرا، بارش اور ہوا کے تیز و تُند جھونکوں کا شور اور بارش کا پُرزور پانی۔ ایسے میں ایک قدم اُٹھانا بھی مُحال تھا۔ تاہم راشد ایک ہاتھ سے چھتری پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے بوڑھے کا ہاتھ تھامے، چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی بار پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔

مسجد دُور دُور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں بارش اور تیز ہو گئی۔ شور اور بڑھ گیا۔ بادل اور زور زور سے گرجنے لگے۔ وہ دونوں اِس طوفان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک بوڑھے کی لاٹھی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔

"میری لاٹھی؟" بوڑھے کے مُنہ سے نکلا۔ راشد نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے لاٹھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"چھوڑو، بیٹا۔ نہیں ملتی تو نہ سہی۔ اب گھر قریب ہی ہے" بوڑھے نے کہا۔ راشد اُٹھ بیٹھا اور پھر بوڑھے کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ نہ جانے کس طرح بوڑھا لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ راشد نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر ایک ہاتھ سے وہ کیا کر سکتا تھا۔ بوڑھا گر پڑا۔ ہوا کے تیز جھونکے نے اُس کے پاؤں لڑکھڑا دیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بوڑھے کو اُٹھانے کی کوشش کرے، اُس نے بجلی کی چمک میں ایک آدمی کو دیکھا جو کچھ فاصلے سے اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کی نظریں اُن پر جمی تھیں۔ خوف کے مارے راشد کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ اِس خوف اور دہشت کی حالت میں وہ ایک دم مُڑا اور پوری قوّت سے بھاگنے لگا۔

وہ بھاگتا جا رہا تھا کہ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ پھر جلدی سے اُٹھ کر اُسی رفتار سے بھاگنے لگا۔ نہ جانے بھاگتے بھاگتے وہ کدھر نکل گیا تھا۔ اُسے اپنا مکان نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی سانس پھول گئی تھی۔ اُسے ایک اور ٹھوکر لگی۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ اِس کے بعد اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں اُس پر جھکی ہوئی ہے۔

"امّی" اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"شکر ہے اللہ تیرا۔ بیٹا، فکر کی کوئی بات نہیں۔تم اپنے گھر میں ہو۔"

ماں کے چہرے کے بعد اُس نے اپنے ابّو کا چہرہ بھی دیکھا۔ اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ کسی سے گفت گو کر سکے۔ ماں، باپ اور بہن بھائیوں نے بھی اُس سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ امّی نے اُس کے ہونٹوں سے دودھ کا گلاس لگا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔

صبح کی روشنی میں اُس نے اپنے اِردگرد دیکھا تو ہر چیز جانی پہچانی لگی۔ یہ اُس کے گھر ہی کا کمرا تھا۔ سامنے دیوار پر کلاک لگا تھا۔ دیواروں پر تصویریں تھیں۔ اُس کے پلنگ سے کچھ دُور کُرسیاں تھیں۔ کھڑکی میں سے سورج کی شُعاعیں اندر آ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ وہ بارہا دیکھ چکا تھا۔ امّی نے اُسے بٹھا کر اُس کی پُشت گاؤ تکیے سے لگا دی۔

"راشد بیٹا، تم نے تو بتایا تھا کہ تم ایک بوڑھے کو اُس کے بیٹے کے گھر پہنچانے جا رہے ہو۔ پھر کیا ہُوا؟ تم اپنے گھر کے پاس اپنے باپ کو گرے ہوئے ملے۔ بے ہوش ہو گئے تھے۔"

راشد نے سارا واقعہ سُنایا۔ اُس کے ابّو بھی پلنگ کے قریب کُرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کہا "بیٹا، ہو سکتا ہے وہ بوڑھا اُس گروہ کا آدمی ہو جو بچّوں کو اِغوا کرتا ہے۔ جس شخص کو تم نے اپنی طرف آتے دیکھا تھا، وہ اُس کا ساتھی ہو گا۔"

"مگر ابّو، وہ بوڑھا ایسا نہیں لگتا تھا" راشد نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ابّو نے کہا۔ راشد کی امّی نے بھی سر ہلا کر اُن کی تائید کی۔

رات کو سونے سے پہلے راشد نے سارے واقعے کو یاد کیا۔ اُس کے ابّو نے بتایا تھا کہ بوڑھا ایک خطرناک گروہ کا آدمی ہو گا اور وہ اُسے اُدھر ہی لے جا رہا تھا جدھر سے وہ دوسرا آدمی آیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے بوڑھے کی صورت راشد کی نظروں کے سامنے آ گئی۔ جس وقت وہ چھاتا اُس کے اُوپر تانے چلا جا رہا تھا تو کئی بار بجلی کی چمک میں اُس نے اُس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ چہرہ اُسے خوف ناک بالکل دکھائی نہیں دیا تھا۔

وہ اپنے ابّو کی بات ماننے کے لیے تیّار نہ تھا لیکن اُس کے اندر ایک نامعلوم سا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کی ماں نے اُس سے دو تین بار کہا تھا "راشد بیٹا، رات والا واقعہ بھول جاؤ۔ سمجھ لو تم نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" اُس نے ماں کی بات ماننے کی کوشش کی تھی اور وہ اُس میں کچھ کام یاب بھی ہو گیا تھا، لیکن چند روز بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔

اِتوار کی آدھی چھٹّی ہوئی تو وہ کھیل کے میدان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگا۔ اُس کے ایک ساتھی نے زور سے ہِٹ لگائی تو گیند تیزی سے اُس طرف چلی گئی جہاں گُلاب کے پودے تھے۔ وہ گیند کے پیچھے دوڑا مگر گیند پودوں میں چُھپ گئی تھی۔ وہ پودوں کے قریب گیا تو اُس نے وہاں ایک بوڑھا آدمی دیکھا جو ایک چھوٹے سے لڑکے سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ وہی بوڑھا تھا! وہ خوف زدہ ہو گیا اور گیند کا خیال چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے اُس کا ہاتھ خالی دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا "گیند کہاں ہے؟"

"نہیں ملی" اُس نے جواب دیا۔

اُسی وقت بالر اور دو لڑکے گلاب کے پودوں کی طرف دوڑے اور راشد دوسری طرف بانڈری کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اب وہ بوڑھے سے خاصا دُور ہو گیا تھا۔ کھیل جاری رہا لیکن راشد کھیل میں دل چسپی نہ لے سکا۔ بے دلی سے کھیلتا رہا۔

دوسرے روز اِسکول میں آدھی چُھٹّی ہوئی اور وہ کوئی کھانے کی چیز لینے کے لیے اِسکول کے گیٹ سے باہر نکلا تو اُسے وہی بوڑھا نظر آیا۔ وہ جلدی سے واپس آ گیا اور کلاس میں جا

کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت وہاں کوئی لڑکا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی اور لڑکے شور مچاتے ہوئے کلاسوں میں آنے لگے۔

راشد تمام وقت خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب سبق پڑھاتے رہے، اُس کی نظریں کتاب پر جمی رہیں مگر دل میں بوڑھے کا خیال رہا۔

گھر آکر اُس نے بستہ رکھا اور اپنی امّی سے اِجازت لے کر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اُس نے کوشش کی کہ بوڑھے کے بارے میں اب کچھ نہ سوچے لیکن باتیں کرتے کرتے اُس کا خیال آنے پر ایک دم رُک جاتا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، راشد؟" دوست نے پوچھا۔

"ٹھیک ہُوں ـــــ کوئی بات نہیں" اُس نے دوست کو اِطمینان دلانے کی کوشش کی۔

شام ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وہ دوست کے گھر سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کا کمرا ڈرائنگ روم میں سے گزر کر آتا تھا۔ اُس نے ڈرائنگ روم کے اندر قدم رکھا تو اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اُوپر کا اُوپر رہ گیا۔ وہی بوڑھا سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور اُس کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

"آ جاؤ، بیٹا؟" بوڑھے نے اپنا دایاں ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کیا کرے؟ آگے جائے یا جلدی سے باہر نکل جائے؟ اُس نے ابھی کوئی اِرادہ نہیں کیا تھا کہ اُس کے ابّو اندر آ گئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ باپ کو دیکھ کر اُس کی پریشانی دُور ہو گئی۔

"آ جاؤ، بیٹا۔ کتنی دیر سے تُمہارا اِنتظار کر رہا ہوں" بوڑھے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اُسے اپنی طرف بُلایا۔

"ہاں، بیٹے۔ یہ ایک گھنٹے سے تمہارا اِنتظار کر رہے ہیں۔"

باپ کے یہ الفاظ سُن کر راشد بوڑھے کی طرف بڑھا۔

بوڑھا اُٹھ بیٹھا اور راشد کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا "بیٹا، میں نے تمہیں بڑا ڈھونڈا۔ تمہارے گھر کے قریب جتنے اسکول ہیں، وہاں گیا مگر تمہارے گھر کا علم نہ ہو سکا۔ آج جس اسکول میں گیا، وہاں تمہارا نام اُس وقت ایک لڑکے سے پوچھا جب چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی اور لڑکے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اِتفاق سے وہ لڑکا تمہیں جانتا تھا۔ اُس نے تمہارے گھر کا پتا بتا دیا۔ بیٹے، میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اُس اندھیری اور طوفانی رات میں تم نے میری مدد کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے تم مل گئے" بوڑھا دُعائیں دینے لگا۔

راشد کے ابّو جو بوڑھے کے ساتھ صوفے پر بیٹھے تھے، کہنے لگے "راشد بیٹا، ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ یہ تو بڑے ہی مہربان آدمی ہیں۔ اُس رات جب یہ گرے تھے تو تم جس آدمی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے وہ اِن کا بیٹا تھا۔"

"جی ہاں۔ وہ میرا بیٹا تھا۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں گھر سے نکل کر اُس کی طرف آ رہا ہوں، جب میں اس کے گھر نہ پہنچا تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور اُدھر آ گیا۔ میرے چوٹ لگی تھی۔ گر پڑا تھا۔ وہ مجھے گھر لے گیا۔ یہ ہے وہ قصّہ جو میں تمہارے ابّو کو بتا چکا ہوں۔"

راشد کو اپنی غلط فہمی پر افسوس ہُوا۔ اُس نے مُعافی مانگی تو بوڑھے نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس روز کے بعد وہ اُن کے ہاں آنے جانے لگا۔ راشد اُسے تایا جان کہتا تھا۔

سائنس کے کھیل

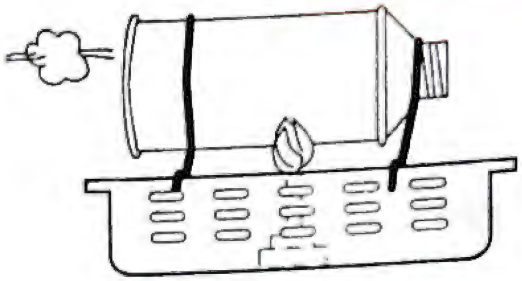

بھاپ سے چلنے والی کشتی

سامان:۔ رُوئی۔ اِسپرٹ یا مٹّی کا تیل۔ طشتری۔ ٹالکم پاؤڈر کا خالی ڈبّا۔ تار۔ صابن دانی۔

ہم جو بھاپ کی کشتی بنانے لگے ہیں وہ بالکل اُسی اُصول کے مُطابق چلے گی، جس اُصول سے جیٹ ہوائی جہاز اُڑتے ہیں۔ اِس لیے اِسے جیٹ کشتی بھی کہا جا سکتا ہے۔

ٹالکم پاؤڈر کے ڈبّے کے پیندے میں ایک کنارے کے قریب کیل سے سوراخ کر لیں۔ پھر صابن دانی لے کر (جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے) تار کی مدد سے اُس پر پاؤڈر کا خالی ڈبّا فِٹ کر دیں۔ (ڈبّے کے پیندے کا سوراخ اُوپر رہے۔) اِس کے بعد ڈبّے میں گرم پانی ڈالیں اور اُس کے نیچے اِسپرٹ یا مٹّی کے تیل میں بھیگا ہُوا رُوئی کا گالا رکھ دیں۔ اب صابن دانی کو پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں رکھ کر رُوئی کو آگ لگا دیں۔ جب ڈبے کے اندر کا پانی گرم ہو گا تو اُس میں سے بھاپ (پچھلے سوراخ کے راستے) نکلے گی اور صابن دانی ڈبّے سمیت آگے کی طرف حرکت کرے گی۔

دھات کی صابن دانی کے بجائے لکڑی کی کشتی اِستعمال کرنا چاہیں تو اِسپرٹ میں بھیگے ہوئے رُوئی کے گالے کے بجائے ڈبّے کے نیچے موم بتّی جلانا پڑے گی تاکہ کشتی کو آگ نہ لگنے پائے۔

حرکت کے لیے قُوّت کی ضرورت ہے

سامان: کھلونا موٹر کار۔ الاسٹک۔

کار چلانے کے لیے قُوّت کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ایک بار اُسے حرکت دے دی جاتی ہے تو پھر اُس حرکت کو قائم رکھنے کے لیے نسبتاً کم قُوّت درکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک مُتحرک چیز کو مُتحرک رکھنے کے لیے جس قدر قُوّت کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے کہیں زیادہ قُوّت کی ضرورت اُسے حرکت دینے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ یہ بات دُرست ہے یا نہیں، آیئے ایک تجربہ کریں۔ ٹرک یا موٹر کار (کھلونا) لے کر اُس میں الاسٹک باندھ دیں۔ پھر اُسے حرکت دینے کے لیے الاسٹک کو کھینچیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کھلونے کو حرکت دیتے وقت الاسٹک کی ڈوری زیادہ کھنچ جاتی ہے اور بعد میں اِس حرکت کو قائم رکھنے کے لیے اِتنی نہیں کھنچتی۔

یہی بات اصل کاروں وغیرہ کے سلسلے میں بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ نیوٹن کے کُلّیے کے مُطابق ہر مادی چیز کی ایک خاصیّت یہ ہے کہ اگر وہ ساکن ہے تو ساکن ہی رہے گی اور اگر مُتحرک ہے تو مُتحرک رہے گی، جب تک کہ اُس چیز پر کوئی مُخالف قُوّت عمل نہ کرے۔ چیزوں کی اِس خاصیّت کو "جمُود" کہتے ہیں۔

جمُود کا مُشاہدہ کئی باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ سائیکل پر کوئی وزنی چیز رکھ کر لے جانا چاہیں تو سائیکل کو حرکت دینے میں آپ کو زیادہ زور لگانا پڑے گا، اور جب سائیکل ایک بار چل پڑے گی تو اُسے چلتا رکھنے میں زیادہ قُوّت کی ضرورت نہ ہو گی۔ البتّہ جب آپ اُسے روکنا چاہیں گے تو پھر اُسے روکنے کے لیے زیادہ قُوّت درکار ہو گی۔

سید نظر زیدی

دادا ابّا کی سالگرہ

Sharjeel Ahmed

آج گھر میں بہت رونق تھی۔ سب بچّوں نے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے۔ یہ اُن کے دادا ابّا کی سال گرہ کا دِن تھا۔ ہر سال مئی کی 15 تاریخ کو دادا ابّا اپنے دوستوں کو بلاتے اور موم بتّیاں بُجھاتے اور کیک کاٹتے تھے۔ اگرچہ اِس تقریب میں بچّوں کو باقاعدہ نہ بُلایا جاتا تھا، لیکن وہ خود ہی شامل ہو جاتے تھے۔ بھلا کیک، مٹھائی اور چائے کیسے چھوڑی جا سکتی تھی۔

آج مئی کی پندرہ تاریخ تھی اور غُفران، عُثمان اور شمسہ مہمانوں کے آنے سے کافی دیر پہلے ہی اُس کمرے میں آ گئے تھے جس میں کیک اور موم بتّیاں رکھی گئی تھیں۔

تینوں بچّے اُن کرسیوں پر بیٹھ گئے جو کیک والی میز سے ذرا فاصلے پر رکھی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے ایک ایک چیز کو دیکھتے رہے۔ پھر عُثمان یُوں اپنی جگہ سے اُٹھا جیسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو اور کیک والی میز کے پاس جا کر موم بتّیاں گِننے لگا۔ غُفران اور شمسہ مسکراتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کو اُس کی یہ حرکت عجیب سی لگی۔

عُثمان موم بتّیاں گِن چکا تو شمسہ بولی "عثمان بھائی، کیا دادا ابّا کی عُمر کے بارے میں کچھ شک پیدا ہو گیا تھا؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ اور میرے دل میں جو شک پیدا ہوا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا۔"

"کیا کہ رہے ہیں آپ؟" غُفران نے سوال کیا۔

"یہاں آ کر دیکھو۔ کیا ہمارے دادا ابّا صِرف 30 برس کے ہیں؟" عثمان نے موم بتّیوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا" میں نے اچھی طرح گنی ہیں۔ کُل تیس ہیں، یعنی 29 اور ایک۔"

"واہ بھئی واہ! یہ تو خوب ہوئی! اِس کا تو یہ مطلب ہُوا کہ دادا ابّا بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتے ہیں۔" غفران بھی اُٹھ کر میز کے پاس آ گیا اور موم بتّیاں گِننے لگا۔ شمسہ بھی اُٹھ کر آ گئی

اور وہ بھی موم بتّیاں گننے لگی۔ وہ تیس ہی تھیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ تینوں بچّے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ دادا ابّا نے ایسی عجیب بات کیوں کی ہے۔

"میرا خیال ہے، موم بتّیوں کے سلسلے میں ضرور بابا سے غلطی ہو گئی ہے" عثمان نے کہا۔ بابا اُن کا پُرانا مُلازِم تھا۔

"لیکن بابا بے پروائی کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ ہر کام بہت محنت اور شوق سے کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ اور ہی مُعاملہ ہے" شمسہ بولی۔

"پھر اِس کے سِوا اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ دادا ابّا اپنی عُمر تیس برس ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ ماشاء اللہ اُن کی صِحّت تو جوانوں سے بھی اچھی لگتی ہے لیکن وہ ہیں تو بوڑھے ہی" عُثمان بولا۔

غُفران اُس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دادا ابّا کے دوست مِرزا صاحِب کمرے میں داخل ہوئے اور بچّوں کو دیکھ کر بولے "بھئی واہ! خاص مہمان تو پہلے ہی پہنچ گئے ہیں۔ کہو بچّو، کیا حال ہے تم سب کا؟"

"جی، خدا کے فضل سے ہم سب بِالکُل ٹھیک ہیں" عثمان نے ادب سے جواب دیا۔

"اور وہ تمہارے دادا جان کہاں ہیں؟ بُلاؤ نا اُنہیں۔ وہی بات ہے کہ بارات حاضِر، دُولہا غائب۔" یہ کہتے ہوئے مرزا صاحِب کُرسی پر بیٹھ گئے اور رُومال سے عینک کے شیشے صاف کرنے لگے۔ یہ اُن کی خاص عادت تھی۔

"جی، وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ میں آپ کے آنے کی اِطّلاع کرتی ہوں" شمسہ نے کہا اور دادا ابّا کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔

ذرا دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ دادا ابّا بھی آ گئے اور سال گرہ کی تقریب شروع ہو گئی۔ دوستوں کے قہقہوں کے درمیان دادا ابّا نے موم بتّیاں بُجھائیں، کیک کاٹا اور پھر سب چائے اور مٹھائی اُڑانے لگے۔ ساتھ ہی باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا جن میں چُٹکلوں اور لطیفوں کی پھُلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ لگتا تھا دادا ابّا اور اُن کے بوڑھے دوست پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔ سب کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

دادا ابّا کی سال گرہ کی اِس تقریب میں کیک، مٹھائی کھانے اور چائے پینے کی حد تک تینوں بچّوں نے بھی خوب حِصّہ لیا تھا۔ لیکن وہ اُس خوشی میں شریک نہ ہو سکے جو دادا ابّا اور اُن کے دوستوں نے ظاہر کی تھی۔ اوّل تو یہی بات اُن کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی کہ بُڑھاپے میں دادا ابّا کو اپنی سال گرہ کی کیا سُوجھی ہے۔ اِس پر موم بتّیوں کی تعداد والے مُعاملے نے اُن کے ذہنوں کو اور اُلجھا دیا تھا۔

تقریب ختم ہونے کے بعد وہ کافی دیر اِسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو یہ طے کر کے دادا ابّا کے پاس گئے کہ خود اُنہی سے پُوچھ لیا جائے۔

دادا ابّا نے بچّوں کو دیکھا تو خوش ہو کر بولے "آؤ، بھئی، آؤ۔ کہو، ہماری سال گِرہ پسند آئی؟"

"بہت پسند آئی، دادا ابّا" شمسہ نے خوشی بھری آواز میں جواب دیا۔

"کیک کا ایک آدھ پیس تُم لوگوں کے حِصّے میں بھی آیا کہ نہیں؟"

"جی، بس آ ہی گیا۔ ویسے ہم تو دادا ابّا آپ کے دوستوں کو کیک اور مٹھائی کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔"

دادا ابّا نے ہنس کر کہا "ہاں، وہ لوگ ماشاء اللہ اِس سلسلے میں خاصی بہادری اور پھُرتی دکھاتے ہیں۔ ویسے بچّو، اُن کی چھینا جھپٹی اصلی نہیں ہوتی۔ وہ کچھ دیر خوش ہونے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے کھانے پینے کے معاملے میں تنگی ہو۔"

"ہم یہ بات سمجھتے ہیں، دادا ابّا، اور اِسی لیے اُنہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے" شمسہ نے کہا۔

"پھر تو ماشاء اللہ ہماری بیٹی بہت سمجھ دار ہو گئی ہے" دادا ابّا نے پیار سے شمسہ کے کندھے پر تھپکی دی۔ پھر بولے

"اچھا، یہ تو بتاؤ، اس وقت تم لوگ کسی خاص کام سے تو نہیں آئے؟"

"جی، آئے تو کام ہی سے ہیں۔ دراصل ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ آپ کی سال گرہ کی موم بتّیاں کم کیوں تھیں؟ ہم نے تو سُنا ہے کہ جتنی عُمر ہوتی ہے، اُتنی ہی موم بتّیاں بُجھائی جاتی ہیں" غُفران نے سوال کیا۔

یہ سُن کر دادا ابّا نے تعریف بھری نظروں سے غُفران کی طرف دیکھا اور جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر بولے "بیٹے، تمہارا یہ سوال سُن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ماشاء اللہ تم بہت سمجھ دار بچّے ہو۔ جو بچّے سمجھ میں نہ آنے والی چیزوں کے بارے میں غور کرتے ہیں اور پھر بڑوں سے اُن کے بارے میں پوچھتے ہیں، بڑے ہو کر کام یابیاں حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں اُمّید ہے تم ضرور بڑے آدمی بنو گے اور اپنے خان دان اور وطن کا نام روشن کرو گے۔ لو، یہ تمہارا اِنعام ہے۔"

عُثمان جلدی سے بولا "لیکن دادا ابّا، یہ بات پہلے میں نے سوچی تھی۔ اِنعام مجھے ملنا چاہیے۔"

شمسہ بولی "اور دادا ابّا، یہ بات میں نے کہی تھی کہ موم بتّیوں کا راز ہمیں دادا ابّا سے پوچھنا چاہیے۔ اِس لیے اِنعام کی اصل حق دار تو مَیں ہوں۔"

دادا ابّا ہنستے ہوئے بولے "اچھا، تو یُوں کرو کہ یہ پچاس روپے تم تینوں بانٹ لو۔ بلکہ ہمارا خیال ہے پہلے آئس کریم کھاؤ اور پھر جتنے روپے بچ جائیں، وہ آپس میں تقسیم کر لو۔ تمہارے سوال کا جواب پھر دیں گے۔ کہو خوش؟"

"جی، بہت خوش" تینوں نے ایک ساتھ کہا اور باہر کی طرف بھاگے۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد دادا ابّا نے تینوں بچّوں کو بُلایا اور پیار سے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے "لو، بچّو۔ اب ہم تمہارے سوال کا جواب دیتے ہیں۔

"اب سے 30 برس پہلے کی بات ہے، ایک بابُو صاحِب کسی سرکاری دفتر میں کام کرتے تھے۔ یہ دفتر ایک ایسے محکمے کا تھا جس میں رِشوت بہت چلتی تھی اور معمولی سا کام بھی رِشوت کے بغیر نہ کیا جاتا تھا۔ اِس سے بھی بُری بات یہ تھی کہ کوئی اِسے بُرا نہ سمجھتا تھا۔ اُوپر کے افسر تک اپنا حِصّہ وصول کرتے تھے۔"

"دادا ابّا، رِشوت تو بہت بڑا گُناہ ہے۔ اللہ کے سچّے رسُول صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں دوزخ میں جائیں گے؟" عثمان نے کہا۔

"ہاں، بیٹا۔ ایسا ہی ہے۔ اور یہ سزا رشوت خوروں اور رشوت دینے والوں کو اِس لیے دی جائے گی کہ اِس سے بہت زیادہ فساد پھیلتا ہے۔ رشوت دینے والا ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لیے رشوت دیتا ہے اور لینے والا کچھ روپے لے کر کسی حق دار کو اُس کے حق سے محروم کر کے رشوت دینے والے کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بہرحال، ہم سُنا رہے تھے ایک بابُو صاحِب کی بات۔ یہ بابُو صاحِب بھی اپنے ساتھیوں کی طرح خوب رشوت لیتے تھے۔

"ایک دن کسی اِسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحِب کسی کام کے سلسلے میں اُن کے پاس آئے اور اُنھوں نے اپنی عادت کے مُطابِق اُن سے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے وہ جان جائیں کہ جب تک وہ کچھ دیں گے نہیں، اُن کا کام نہ ہوگا۔

اِس دوران میں دفتر کا چپراسی بھی آ گیا اور اُس نے بھی ہیڈ ماسٹر صاحِب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بابُو صاحِب کی مُٹھی گرم کرو گے تو کام ہو گا۔"

یہاں تک کہہ کر دادا ابّا نے کُرسی سے کمر لگا کر آنکھیں بند کر لیں، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ کچھ دیر اِسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر بولے "بچّو، وہ ہیڈ ماسٹر صاحِب بابُو صاحِب کا مطلب سمجھ کر بولے "بیٹے، جس کام کے لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں، وہ تو ہوتا رہے گا، پہلے ہمیں یہ بتائیں کہ آپ مُسلمان ہیں؟"

"خدا کے فضل سے پکّا اور سچّا خاندانی مُسلمان ہوں۔ آپ نے دروازے پر لگی ہوئی تختی پر میرا نام نہیں پڑھا؟" بابُو

صاحب نے جواب دیا۔

"اور آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جس ملک میں رہتے ہیں، اُس کا نام پاکستان ہے؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے دوسرا سوال کیا۔

"کیوں نہیں جانتا" بابُو صاحب نے اُکتا کر جواب دیا۔

"اچھا، ایک سوال اور۔ یہ بتا دیں کہ اگر کسی آدمی نے بی اے کا امتحان پاس نہ کیا ہو اور وہ اپنے نام کے ساتھ صرف اِس لیے بی اے لکھنا شروع کر دے کہ اُس کے والد صاحب بی اے تھے تو آپ اُسے کیا کہیں گے؟"

"احمق کہوں گا، اور کیا کہوں گا۔ اُس کی یہ غلطی تو ایسی ہے کہ اُسے سزا ہو سکتی ہے" بابُو صاحب نے کہا۔ وہ اب ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف یُوں دیکھ رہے تھے جیسے اُن کے دماغ کے بارے میں اُنہیں شک ہو گیا ہو۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُن کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا، پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولے "میرے عزیز، میں نے آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب کوئی شخص تعلیم حاصل کیے بغیر اپنے نام کے ساتھ بی اے نہیں لکھ سکتا تو اپنے دین اِسلام کی باتوں پر عمل کیے بغیر اپنے آپ کو مُسلمان کس طرح کہہ سکتا ہے؟ اور اگر کہتا ہے تو اُس آدمی کی طرح جُرم کرتا ہے جو بی اے پاس کیے بغیر اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھتا ہے۔"

"دادا ابّا، ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ صرف ہمارے مُلک کیا، پوری دنیا میں زیادہ مُسلمان ایسے ہی ہیں جو اپنے دین کی اچھی باتوں پر عمل نہیں کرتے، پھر بھی اپنے آپ کو مُسلمان کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے، بابُو صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہو گی اور اُنہوں نے رِشوت لیے بغیر ہیڈ ماسٹر صاحب کا کام کر دیا ہو گا؟" غُفران بولا۔

دادا ابّا افسوس بھری آواز میں بولے "نہیں، بیٹے۔ وہ تو اُن کی باتیں سُن کر بہت ناراض ہوئے۔ اُن کو خوب جلی کٹی سُنائیں اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ 500 روپے جیب میں ہیں تو نکالو، ورنہ راستہ ناپو۔ تمہارا کام آج نہیں ہو سکتا۔ پھر کسی دن آنا۔ یہ سُن کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے کاغذ اُٹھائے اور وہاں سے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد بابُو صاحب نے غُصّے میں ہُنکارا بھرا "ہُونہہ! چلے آتے ہیں مُنہ اُٹھائے۔ جیسے اُن کے ابّا جان کے نوکر بیٹھے ہوئے ہیں دفتروں میں۔"

"دادا ابّا، سرکاری دفتروں میں کام کرنے والوں کو اِسی بات کی تو تنخواہ ملتی ہے کہ وہ لوگوں کے کام کریں" عُثمان نے کہا۔

دادا ابّا بولے "ہاں، تم نے ٹھیک کہا۔ اب اِس سے آگے کی کہانی سُنو۔ بابُو صاحب دفتر سے گھر گئے تو اُس رات اُنہوں نے خواب میں دیکھا کہ پولیس نے رِشوت لینے کے اِلزام میں اُنہیں گرفتار کر لیا ہے۔ اُن کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہیں اور عدالت میں اُن پر مُقدّمہ چل رہا ہے۔ لوگ باری باری آ رہے ہیں اور گواہی دے رہے ہیں کہ یہ پکّا رِشوت خور ہے، بے ایمان ہے، سخت دِل ہے۔ اِسے کسی پر رحم نہیں آتا۔ وہ مجرموں کے کٹہرے میں سر جُھکائے کھڑے ہیں۔ لوگ نفرت بھری نظروں سے اُنہیں دیکھ رہے ہیں۔

کافی دیر یہی حالت رہتی ہے۔ آخر گواہوں کی لمبی قطار ختم ہوتی ہے اور جج صاحب فیصلہ سُناتے ہیں "گواہوں کے بیانوں سے ثابت ہو گیا کہ یہ شخص پکّا بے ایمان ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ اِسے نوکری سے نکال دیا جائے، اِس کی ساری جائیداد ضبط کر کے نیلام کر دی جائے اور اِس سے جو روپیہ ملے وہ ان لوگوں کو دے دیا جائے جن سے اِس نے رشوت لی ہے۔ اِس کے علاوہ اِسے دو سال کے لیے جیل خانے بھیج دیا جائے اور ایسا کام لیا جائے جس سے اِس کی بہت ذِلّت ہو اور اِسے بہت تکلیف پہنچے۔" جج صاحب کا یہ فیصلہ سُن کر بابُو صاحب کے مُنہ سے چیخ نکل جاتی ہے اور اُن کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔

"بچّو، جانتے ہو وہ بابُو صاحب کون تھے؟ وہ ہم خُود تھے۔

خواب دیکھ کر آنکھ کُھلی تو ہمارا سارا بدن پسینے میں بھیگا ہُوا تھا، دل دھک دھک کر رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے جج صاحب نے سچ مُچ ہمیں سزا سُنائی ہے۔ ہم اُسی وقت اُٹھے، وضُو کر کے نفل پڑھے، پھر رو رو کر اپنے گُناہوں کی مُعافی مانگی اور اللہ سے پکّا وعدہ کیا کہ آیندہ ایک سچّے مُسلمان کی زندگی گزاریں گے اور وہ ساری جائیداد جو رِشوت کے مال سے بنائی ہے فروخت کر کے اُس رقم کو اچھّے کاموں میں لگا دیں گے۔ نماز پڑھنے اور دُعا مانگنے کے بعد اُٹھے تو دل پر چھایا ہوا خوف دُور ہو چکا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ یہ دن ہماری زندگی کا پہلا دن ہے۔

"اور پیارے بچّو، یہ سال گِرہ ہم اپنی اِسی نئی زندگی کی مناتے ہیں جس کے حساب سے اب ہماری عمر 30 برس ہوئی ہے۔ کہو، اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ سال گرہ کی تقریب میں موم بتّیوں کی تعداد تیس کیوں تھی؟"

دادا ابّا نے بات ختم کی تو تینوں بچّوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا "دادا ابّا، زندہ باد! ہمارے دادا ابّا، پایندہ باد!"

---

9 کا جادُوئی ہندسہ

9 کا ہندسہ سچ مُچ جادُو کا ہندسہ ہے!

اگر آپ 1,2,3,4,5,6,7,8,9 کو جمع کریں گے تو 45 جواب آئے گا۔ اب 5 اور 4 کو جمع کریں تو جواب آئے گا 9 ۔ کسی بھی نمبر کو 9 سے ضرب دیں۔ حاصلِ ضرب ہِندسوں کو جمع کریں گے تو جواب 9 ہی آئے گا۔ مثلاً :

1 + 8 = 9	9 × 2 = 18
2 + 7 = 9	9 × 3 = 27
3 + 6 = 9	9 × 4 = 36
4 + 5 = 9	9 × 5 = 45
5 + 4 = 9	9 × 6 = 54
6 + 3 = 9	9 × 7 = 63
7 + 2 = 9	9 × 8 = 72
8 + 1 = 9	9 × 9 = 81

اِس سے بڑے نمبر لے لیں اور اُنہیں 9 سے ضرب دیں۔ پھر حاصلِ ضرب کے ہندسوں کو جمع کریں۔9 جواب آئے گا۔ یقین نہ ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ مثلاً :

9 × 183 = 1,647;1+ 6 + 4 + 7=18

9 = 8 + 1 ——— کوئی بھی بڑے سے بڑا نمبر لیں۔ مثلاً 456 ۔ اِسے اُلٹا کریں۔ یہ بن گیا 654 ۔ اب 654 میں سے 456 کو تفریق کریں۔ جو جواب آئے گا، وہ 9 پر پورا پورا تقسیم ہو جائے گا۔ مثلاً

654
- 456
198

198 ÷ 9 = 22

آیئے مسکرائیں

Sharjeel Ahmed

ایک فقیر سڑک پر صدا لگا رہا تھا "ہے کوئی اللہ کا بندہ جو مجھ اندھے محتاج کو ایک روپیہ دے دے؟"

ایک راہ گیر نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر بولا "مگر تم تو کانے ہو۔"

فقیر نے کہا "چلو، آٹھ آنے ہی دے دو۔"

(وسیم علی، اسلام آباد)

ایک سکھ سردار صاحب گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک آدمی ملا۔ انہوں نے اُس سے پوچھا "بھلا بتاؤ تو، میں کس چیز پر سوار ہوں؟"

آدمی حیران ہو کر بولا "سردار صاحب، آپ کو نہیں معلوم کہ آپ گھوڑے پر سوار ہیں؟"

سردار صاحب بولے "معلوم تو مجھے بھی ہے، پھر بھی چیک کرنے میں کیا حرج ہے؟"

(ثمرین فیضی، سمن آباد لاہور)

ایک ماں نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "یاد رکھو! ہم اِس دُنیا میں دوسروں کی خدمت کرنے آئے ہیں۔"

بچّے نے تھوڑی دیر سوچا، پھر پوچھا "اور امّی، دوسرے یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

(کاشف محمود دانش، منڈی بہاؤالدین)

دو گپّی بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک بولا "میرے دادا جان بہت اچھے نشانہ باز تھے۔ ایک دفعہ اُنہوں نے مٹکے میں پانی بھر کر لٹکا دیا۔ پھر بندوق سے اُس کا نشانہ لیا۔ مٹکے میں سوراخ ہو گیا۔ سارا پانی گر گیا مگر مٹکا وہیں لٹکا رہا۔"

دوسرا گپّی بولا "یہ تو معمولی بات ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا جان نے مٹکے میں پانی ڈال کر لٹکایا اور اُس کا نشانہ لیا تو مٹکا گر گیا مگر پانی وہیں لٹکا رہا۔" (سمیرا حمید، اقبال ٹاؤن لاہور)

اُستاد: اسلم، بتاؤ، یہ کون سا زمانہ ہو گا: تم نہا رہے ہو، میں نہا رہا ہوں، ابّو نہا رہے ہیں، ہم سب نہا رہے ہیں؟

اسلم: سر، عید کا زمانہ۔

(کاشف محمود دانش، منڈی بہاؤالدین)

سڑک پر ایک بڑا سا پتّھر پڑا تھا، جس پر لکھا تھا "جس کو قسمت آزمانی ہو، وہ یہ پتّھر اُٹھا کر نیچے دیکھے۔"

ایک راہ گیر نے پتّھر اُٹھایا تو نیچے لکھا تھا "پتّھر واپس رکھ دو۔ تم جیسے اور بے وقوف بھی آتے ہوں گے۔"

(عائشہ خان مندوخیل، کوئٹہ)

ایک قیدی جیل سے رِہا ہو رہا تھا۔ اُس کے دوست نے پوچھا "تم رِہا ہو کر سب سے پہلا کام کیا کرو گے؟"

قیدی بولا "سب سے پہلے میں ٹارچ خریدوں گا، کیوں کہ پچھلی مرتبہ میں نے بجلی کا بٹن آن کرنے کے بجائے ریڈیو کا بٹن آن کر دیا تھا۔" (مُبشّر علی، ساہیوال)

ایک شکاری (اپنی بیوی سے) میں نے شیر کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ہاتھی کو سُونڈ سے پکڑ کر نیچے پٹخ دیا۔ گینڈے کو مُکّا مار کر ڈھیر کر دیا۔

بیوی (حیرت سے) پھر کیا ہُوا؟

شکاری: دُکان دار نے مجھے اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔

(ہُما قاضی، پشاور)

ٹھنڈی میٹھی آئس کریم

آپ نے بازار کی آئس کریم تو بہت کھائی ہوگی۔ آج گھر میں بنا کے کھائیں۔ یہ بازار کی آئس کریم سے بہت سستی پڑے گی اور مزے دار بھی بہت ہوگی۔

اگر آپ کے ابّا جان یا بھائی جان کافی پیتے ہیں تو گھر میں کافی کے خالی ڈبّے (ٹن) ضرور ہوں گے۔ نہ ہوں تو کسی کباڑیے سے دو ڈبّے (ایک ایک پونڈ کا اور دوسرا تین پونڈ کا) خرید لیجیے۔ باقی چیزیں گھر ہی میں مل جائیں گی۔

چینی: 3/4 کپ (پون پیالی)

دودھ: ایک کپ

انڈا: ایک

کریم: ایک کپ (گھر میں نہ ہو تو بازار سے خرید لیں)

ونیلا خوشبو: ایک چائے کا چمچہ

نمک: آدھا کپ

برف: ایک کلو (چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ریفریجریٹر کے آئس کیوب بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔)

پہلے کافی کے ڈبّوں کو اچھی طرح دھو لیجیے۔ اس کے بعد چھوٹے ڈبّے میں چینی، دودھ، انڈا، کریم اور ونیلا ڈال کر بڑے چمچے سے اتنا پھینٹیے کہ سب چیزیں گھل مل جائیں۔ اب ڈبّے کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر دیجیے۔

اس چھوٹے ڈبّے کو بڑے ڈبّے کے بیچ میں اس طرح رکھیے کہ اُس کے چاروں طرف جگہ خالی رہے۔ پھر اس خالی جگہ میں اتنی برف ڈالیے کہ ایک تہائی ڈبّا بھر جائے۔ برف کے اُوپر ایک چمچہ نمک چھڑک دیں۔ اس کے بعد اتنی ہی برف اور ڈالیں، اور اُس کے اُوپر اتنا ہی نمک چھڑک دیں۔ پھر ڈبّے کو مُنہ تک برف سے بھر کے اُوپر باقی نمک چھڑک دیں، اور مضبوطی سے ڈھکن لگا دیں۔

اب آپ اور آپ کا بھائی (بہن یا امّی) آمنے سامنے بیٹھ جائیں۔ دونوں کے درمیان چھ سات فٹ کا فاصلہ ہو۔

ڈبّے کو فرش پر لٹا دیں اور پھر ہتھیلی سے، ذرا زور سے، اپنے بھائی کی طرف لُڑھکائیں۔ ڈبّا لُڑھکتا ہُوا اُس کے پاس پہنچے تو وہ بھی فوراً اُسے اُتنے ہی زور سے آپ کی طرف لُڑھکا دے۔ 25، 30 منٹ تک اسی طرح لُڑھکاتے رہیے۔ اس کے بعد پیالے یا آئس کریم کے کپوں میں آئس کریم نکال لیجیے اور مزے لے لے کر کھائیے۔

حفیظ الرحمٰن احسن

آؤ اب آرام کریں

Sharjeel Ahmed

آؤ اب ہم سو جائیں
صُبح سویرے اُٹھنا ہے
گہری نیند میں کھو جائیں
پھر اِسکول کو جانا ہے

ابّو شام کو آئے ہیں
سارا دن تھے دفتر میں
تھکے تھکے سے لگتے ہیں
شام کو آئے ہیں گھر میں

امّی تو گھر پر ہی تھیں
کتنے کام سنوارے ہیں
کاموں میں مصروف رہیں
وہ سب کام ہمارے ہیں

مِل جُل کر ہم بیٹھے ہیں
"کوئی کہانی اچھی سی
امّی، ابّو، اختر، مَیں
اچھی اور اُلبیلی سی"

لیکن آج نہیں، اب کل
نیند بھی ہے کیا پیاری شے
آنکھیں نیند سے ہیں بوجھل
اب سونا ہی بہتر ہے

"ابّو، آپ کریں آرام
آئیں، ہم سب سو جائیں
امّی، آپ بھی چھوڑیں کام
میٹھی نیند میں کھو جائیں"

قدرت کے عجوبے

Sharjeel Ahmed

تین آنکھوں والی چھپکلی

ڈائنوسار تو مدت ہوئی دُنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن اُن کے خاندان کی ایک عجیب و غریب چھپکلی اب بھی نیوزی لینڈ کے ساحل کے قریب جزیروں میں پائی جاتی ہے۔ اِسے ٹواٹارا (Tuataras) کہتے ہیں۔ دو فٹ لمبی اِس چھپکلی کی تین آنکھیں ہوتی ہیں۔ تیسری آنکھ سر کے بیچوں بیچ ہوتی ہے اور اُس کے اُوپر شفاف جھلّی لگی ہوتی ہے۔ اِس آنکھ سے وہ رات کے اندھیرے میں بھی بہ خوبی دیکھ سکتی ہے۔

یہ چھپکلی دن بھر بِل میں دبکی پڑی رہتی ہے اور رات کو خوراک کی تلاش میں باہر نکلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے اور چھوٹے موٹے جانور کھاتی ہے۔ اندھا دُھند شکار کی وجہ سے اِس کی نسل ختم ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے نیوزی لینڈ کی حکومت نے اس کے شکار پر پابندی لگا دی ہے۔

شرُو ایک ننھا مُنا خوف ناک جانور

شرُو (Shrew) دودھ پلانے والے جانوروں (مَیمَل) میں غالباً سب سے چھوٹا جانور ہے۔ اِس کا قد چُوہے کے بچّے کے برابر اور وزن ہمارے پچاس پیسے کے سکّے (اٹھنّی) جتنا ہوتا ہے۔ لیکن اِس کے ننھے مُنّے قد سے دھوکا نہ کھائیے۔ بہت غُصیلا اور خوف ناک جانور ہے۔ کیڑے مکوڑے اور کیچوے کھاتا ہے، لیکن بھوکا ہو تو اپنے سے دوگنے تگنے جانور پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چُوکتا۔ اِس کا دل ایک مِنٹ میں ایک ہزار بار دھڑکتا ہے۔

امریکا میں پایا جانے والا شرُو کھیتوں اور درختوں میں گھر بناتا ہے۔ یہ بہت زہریلا جانور ہے۔ کسی کو کاٹ کھائے تو وہ منٹوں میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اِس کے باوجود یہ کسانوں کے لیے بہت فائدہ مند جانور ہے۔ یہ اُن کیڑے مکوڑوں کو کھاتا ہے جو فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

برقی مچھلی

جنوبی امریکا کے دریاؤں میں ایک ایسی مچھلی پائی جاتی ہے جس کے بدن سے چار سو واٹ کی بجلی خارج ہوتی ہے۔ اِنسان کی تو کیا بساط ہے، گھوڑا بھی اِس کے ایک ہی جھٹکے سے ہلاک ہو جاتا ہے۔

اِسے برقی بام (Electric Eel) کہتے ہیں۔ اِس کی شکل بام مچھلی (اِیل) ملتی جُلتی ہے، لیکن یہ بام کے خاندان سے نہیں ہے۔

آرما دِلو ــــ زِرہ پوش سُورما

آرما دِلو (Armadillo) جنوبی امریکا کا ایک مَیمَل ہے۔ اِسے لوگ زِرہ پوش سُورما کہتے ہیں، کیوں کہ اِس کے بدن پر سر سے لے کر دُم تک، سخت کھپرے (Scales) ہوتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے جیسے اِس نے زِرہ بکتر پہنا ہُوا ہے۔

یہ جانور شکل سے لڑاکا اور خوں خوار لگتا ہے، لیکن اصل میں بہُت بھولا بھالا اور بے ضرر ہے۔ اِس کے دانت تھوتھنی کے آخر میں، حلق کے قریب ہوتے ہیں، اِس لیئے یہ کاٹ بھی نہیں سکتا۔ جب کوئی دُشمن اِس پر حملہ کرے تو بھاگ کر جان بچاتا ہے۔ اِس کی کئی قسمیں ہیں، جن کی لمبائی ایک فُٹ سے پانچ فٹ تک ہوتی ہے۔ بلا نوش جانور ہے۔ جو ملے کھالیتا ہے۔

ایک مچھلی جو بغیر پانی کے زندہ رہ سکتی ہے

عام مچھلیاں پانی کے بغیر چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتیں، لیکن افریقہ میں ایک ایسی مچھلی پائی جاتی ہے جو پانی کے بغیر تین چار سال تک زندہ رہ سکتی ہے۔ اِسے لَنگ فِش (Lung fish) کہتے ہیں۔

یہ مچھلیاں افریقہ کے دَلدَلی عِلاقوں، چشموں اور جھیلوں میں رہتی ہیں۔ جب قحط پڑتا ہے، بارشیں نہیں ہوتیں، چشمے اور جھیلیں خشک ہو جاتی ہیں تو یہ مچھلیاں اپنے جسم کو انگریزی حرف U کی شکل میں موڑ کر جھیل یا دلدل کی تہ میں کیچڑ کے اندر چُھپ کر سو جاتی ہیں اور اُس وقت تک سوتی رہتی ہیں جب تک بارش نہیں ہوتی۔ بعض وقت تین تین چار چار سال تک بارش نہیں ہوتی۔ اس پر بھی یہ مچھلیاں زندہ رہتی ہیں۔

ہوٹ زِن ــــ ایک عجیب پرندہ

جنوبی امریکا میں ایک پرندہ پایا جاتا ہے جسے ہوٹ زن (Hoatzin) کہتے ہیں۔ اِسے قُدرت نے عجیب و غریب خاصیّت عطا کی ہے۔ جب کوئی دشمن اِس پر حملہ کرتا ہے تو یہ اپنے بدن سے ایسی بدبُو خارج کرتا ہے کہ حملہ آور گھبرا کر بھاگ جاتا ہے۔

یہ پرندہ اچھی طرح اُڑ نہیں سکتا۔ درختوں پر چھلانگیں لگاتا پھرتا ہے۔

Sharjeel Ahmed

بستہ کہاں گیا؟

اشتیاق احمد

"ہائیں! احسن! تمہارا بستہ کہاں ہے؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو تمہارے ابّو نے دِلوایا تھا، اور تم ہو کہ مُنہ اُٹھائے چلے آ رہے ہو، بغیر بستے کے۔ اس سے پہلے کہ تمہارے ابّو غسل خانے سے باہر نکلیں، مجھے بتا دو۔ بولتے کیوں نہیں؟ مُنہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں کیا؟"

احسن کی امّی جان رُکے بغیر کہتی چلی گئیں۔ جُوں ہی وہ رُکیں، احسن جلدی سے بولا "آپ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں گی تو کہوں گا نا کچھ۔"

"اچھا، اچھا، زیادہ باتیں نہ بگھارو۔ بستے کی سُناؤ۔ اُس پر کیا بیتی؟ میں تو ابھی نرمی سے پوچھ رہی ہوں۔ تمہارے ابّو کا غصّہ تو آسمان سے باتیں کرنے لگے گا، اور پھر نظر آئیں گے تمہیں دن میں تارے۔ دن میں تارے نظر آنے کا مطلب جانتے ہو؟ مُحاوروں کا اِستعمال تو پڑھاتے ہیں نا تمہارے اُستاد؟ ہاں تو بتاؤ، بستہ کیا ہُوا؟"

"وہ..... وہ امّی جان..... وہ" احسن ہکلانے لگا۔

"وہ..... وہ سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو یہ ہُوں۔ کوئی تم سے دُور فاصلے پر نہیں ہُوں کہ تم وہ وہ کرو۔ گرامر آتی ہے تمہیں؟"

"جی..... جی ہاں۔ آخر نویں کلاس میں پڑھتا ہوں۔ اِتنی گرامر تو آتی ہی ہے کہ وہ اور یہ کے فرق کو سمجھ سکوں۔ لیکن آپ میرا مطلب غلط سمجھیں۔ میں آپ کو وہ نہیں کہہ رہا تھا۔"

"تو پھر کس کے بارے میں کہہ رہے تھے؟"

عین اُس وقت دروازہ کھُلا اور احسن کے ابّو اندر داخل ہوئے۔ وہ تولیے سے بال خُشک کر رہے تھے۔

"کچھ سُنا آپ نے؟" امّی بولیں۔

"نہیں تو۔ میں تو غُسل خانے میں تھا۔ کیسے سُن سکتا تھا؟ ہاں، اب سُن لُوں گا۔ کیا بات ہے؟"

"یہ اپنا بستہ کہیں چھوڑ آیا ہے" امّی بولیں۔

"بہت بُری بات ہے، احسن۔ اب تم نویں جماعت میں پڑھتے ہو۔ بستے تو پہلی جماعت کے بچّے بھی بھول کر نہیں آتے۔ اور پھر تمہارا بستہ پتا ہے کتنا قیمتی ہے؟ اور پھر اُس میں تو تمہاری کتابیں بھی ہیں۔"

"افسوس! ابّو" احسن نے کہنا چاہا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

"افسوس ابّو کیا؟ بھئی، میں بستے کی بات پوچھ رہا ہوں اور تم افسوس ابّو کی بات کر رہے ہو" انہوں نے جھلّا کر کہا۔

"بستہ گُم ہو گیا" احسن نے بہت مُشکل سے کہا۔

"کیا کہا؟ بستہ گُم ہو گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ چلّائے۔

"جی، وہ..... تفریح کی چھٹی ہوئی تو ہم سب لڑکے باہر نکل گئے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ تفریح میں ہم اِسکول سے باہر جا کر کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ کھا پی کر واپس آئے تو بستہ غائب تھا۔"

"تب تو ظاہر ہے کہ یہ کسی کلاس فیلو کا کام ہے۔ تم نے اپنے ماسٹر صاحب سے ذکر کیا؟"

"جی ہاں۔ اُنہوں نے پوری کلاس میں تلاش کروایا، سب لڑکوں سے پُوچھ گچھ کی، لیکن بستے کا کہیں پتا نہ چلا۔"

"کیسے نہیں چلے گا؟ پُورے اڑھائی سو روپے کا ہے اور اِتنی ہی رقم کی اُس میں کتابیں ہیں۔ میں صبح تمہارے اِسکول آؤں گا۔ تم دیکھنا، بستہ کیسے نہیں ملتا۔"

"جی..... جی ہاں..... آپ ضرور آئیں" احسن خوش ہو گیا۔

دوسرے دن احسن کے والد اِسکول پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے اُنہیں بہت اِحترام سے کُرسی پر بٹھایا۔ پھر بولے "میں جانتا ہوں آپ بستے کے سِلسلے میں آئے ہیں۔ شیخ صاحب، میں نے پوری طرح چھان بین کی ہے۔ بستے کا کہیں نام نشان تک نہیں ملا۔ اب میں کسی بچّے کو چور ٹھہراؤں تو کس طرح؟"

"یہ کام میں کروں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور کلاس کے لڑکوں کو مُخاطب کر کے بولے "دیکھو، بھئی۔ جس کسی نے بستہ چُرایا ہے، فوراً بتا دے۔ ورنہ پھر یہاں پولیس آئے گی۔"

"پولیس!" لڑکے خوف زدہ ہو کر بولے۔

"ہاں، پولیس۔ پانچ سو روپے کی چوری ہے۔ اور اگر آج چور نہ پکڑا گیا تو کل وہ پکّا چور بن جائے گا" احسن کے والد نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ تو ہے" ماسٹر صاحب نے کہا۔

"میں ابھی فون کر کے اپنے سُراغ رساں دوست خالد کو بُلاتا ہوں۔"

"سُراغ رساں؟ ارے باپ رے!" کلاس میں کئی آوازیں اُبھریں۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ تم اُن کا نام سُن کر کیوں چونکے؟" شیخ صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"اِس لیے کہ خالد صاحب کے بیٹے بھی یہاں پڑھتے ہیں اور اُن کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں کہ وہ بہت سخت طبیعت کے ہیں" احسن نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ وہ تو چند مِنٹ میں چور کا پتا لگا لیں گے۔ میں بھی کم سخت نہیں ہوں۔ میرا ایک روپیہ بھی ضائع ہو جائے تو میں برداشت نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور فون کرنے کے لیے باہر نکل گئے۔ جلد ہی سُراغ رساں خالد کلاس میں داخل ہوئے۔ اُنہیں ساری بات بتائی گئی تو اُنہوں نے سب لڑکوں پر تیز نظر ڈالی۔ لڑکوں کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً بتا دو کہ بستہ کس نے چُرایا ہے" خالد صاحب کا لہجہ بہت سخت تھا۔

تمام لڑکے خاموش رہے۔ خالد صاحب چند سیکنڈ اِنتظار کرتے رہے۔ پھر بولے "اچھا، تم اِس طرح نہیں بتاؤ گے۔ شیخ صاحب، آپ جائیں، اور ماسٹر صاحب، آپ بھی ذرا باہر

تشریف لے جائیں۔ میں اِن سے پُوچھ گچھ کرنا چاہتا ہُوں۔"

"لیکن خالد صاحِب، اِس بات کا خیال رہے کہ اِن کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ آپ بے شک پانچ سو روپے مجھ سے لے لیں" ماسٹر صاحِب بولے۔

"بات پانچ سو روپے کی نہیں ہے، صاحِب۔ چور کو پکڑا نہ گیا تو وہ ساری زندگی کے لیے چور بن جائے گا۔"

"جی ہاں۔ یہ تو ہے" ماسٹر صاحِب بولے۔

"تو پھر آپ باہر چلے جائیں۔ یہ میرے اپنے بچّے ہیں۔ اِن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ ہاں، چور کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا تو کرنا بھی چاہیئے" ماسٹر صاحِب نے کہا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

خالد صاحِب نے ایک لڑکے سے کہا "امجد، کھڑے ہو جاؤ، اور چور کا نام بتاؤ۔"

"جی، ابّو؟ میں اور چور کا نام بتاؤں؟" اُن کے بیٹے نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں، جلدی سے" وہ بولے۔

"بھلا میں کس طرح بتا سکتا ہوں؟"

"تو کون بتائے گا؟ چور تو تم میں سے ہی کوئی ایک ہے۔ بتاؤ، کون ہے؟"

"جی، ہم بھلا کیا کہہ سکتے ہیں" چند لڑکوں کی آواز آئی۔

"اچھا، سب لڑکے اپنا اپنا بستہ اپنے سامنے رکھ لیں" خالد صاحِب نے کہا۔

لڑکوں نے ایسا ہی کیا۔ خالد صاحب نے سب کے بستوں کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک لڑکے کے پاس پہنچ کر بولے "یہ بستہ تم نے کب خریدا؟"

"جی، ایک دو دن پہلے۔"

"ہم سب ہی نے ایک دو دن پہلے بستے خریدے ہیں۔ نئی کلاسیں جو شروع ہوئی ہیں" ایک اور لڑکا بولا۔

"تم سے کس نے پوچھا؟" وہ غُرّائے۔ سب لڑکے سہم گئے۔

"کس دُکان سے خریدا تھا یہ بستہ؟"

"جی، آصف اِسٹیشنرز سے" اُس لڑکے نے کہا۔

"شکریہ۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"وسیم احمد" اس نے کہا۔

"کلاس میں تمہارا دوست کون ہے؟"

"جی..... میرا دوست..... احسن ہے" اُس نے کہا۔

اب خالد صاحِب کی نظریں احسن پر جم گئیں۔

"احسن، تم بتاؤ بستہ کس نے چُرایا ہے؟"

"انکل، اگر مجھے معلوم ہوتا تو آپ کو یہاں بُلانے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟"

"اچھی بات ہے۔ شام کو بتاؤں گا کہ بستہ کس نے چُرایا ہے۔" اُنہوں نے پُراَسرار انداز میں کہا۔

شام کو خالد صاحِب احسن کے گھر پہنچے۔

"سُنایئے، بستے کے چور کا کیا بنا؟" احسن کے ابّو نے پُوچھا۔

"میں نے اُس کا پتا چلا لیا ہے۔"

"جی؟ کیا کہا؟ پتا چلا لیا ہے؟" احسن چونک کر بولا۔

"ہاں۔ بالکل۔ آخر میں کام کیا کرتا ہُوں" وہ مسکرائے۔

"بہت خوب! تو پھر آپ نے چور کو پکڑ لیا؟" احسن کے ابّو بولے۔

"اِس کے لیے آپ کی اِجازت کی ضرورت ہے۔"

"میری طرف سے اجازت ہے" ابّو نے کہا۔

"تو پھر، احسن! چلو، تھانے" خالد صاحِب احسن کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

"ہائیں! آپ کے خیال میں احسن نے اپنا بستہ خود چُرایا ہے؟" اُس کے والد نے حیران ہو کر کہا۔

"ایسا ہی ہُوا ہے، جناب۔ تفریح میں اِس نے اپنا بستہ سائیکل پر رکھا اور آصف اِسٹیشنرز پہنچا۔ اُن سے اپنا بستہ تبدیل کرایا۔ یعنی ایک اور بستہ لیا اور اپنے کلاس فیلو وسیم احمد کو دے دیا۔"

"کیا مطلب؟" احسن کے ابّو چونکے۔

"وسیم احمد کے والد ابھی چند دن پہلے ہی فوت ہوئے ہیں۔ وہ پہلے ہی بہت غریب تھے۔ اُن کی وفات نے گھریلو حالات اور خراب کر دیے۔ وسیم کی امّی کے پاس نہ بستے کے لیے پیسے تھے، نہ کتابوں کے لیے۔ وسیم بستے کے بغیر اِسکول آیا تو احسن کو بہت رنج ہُوا۔ اِس کی اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا اِس نے یہ چال چلی اور اپنا بستہ تبدیل کرا کے وسیم کو دے دیا۔ اِس کا خیال تھا کہ ابّو اِسے نیا بستہ خرید دیں گے اور اِس طرح وسیم کا کام بن جائے گا۔"

"اوہ!" احسن کے والد دھک سے رہ گئے۔ اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ بولے "تم نے اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے انوکھا طریقہ اِختیار کیا۔ ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھ سے کہتے تو شاید میں اِنکار کر دیتا۔ اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم نے مجھے ایک سبق دیا ہے۔ یہ سبق کہ آیندہ تم مجھ سے کسی بچّے کی مدد کے لیے کہو تو میں اِنکار نہ کروں، ورنہ ....."

احسن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خالد صاحب بھی مسکرانے لگے اور ابّو نے احسن کو گلے لگا لیا۔

پہلے مُرغی پیدا ہُوئی یا انڈا؟

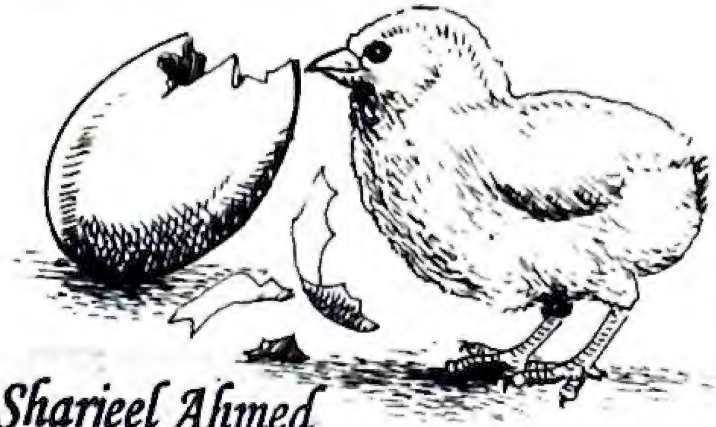

Sharjeel Ahmed

اِس بحث کو چھوڑیے کہ پہلے انڈا پیدا ہوا یا مُرغی۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ انڈے کھایئے اور خوب کھایئے، کیوں کہ انڈا سوائے دل کے مریضوں کے، ہر عُمر کے لوگوں کے لیے بہترین غذا ہے۔ اِس میں پروٹین، وٹامن، آئرن، لوہا اور کیلسیم اِفراط سے ہوتے ہیں، اور یہ سب چیزیں صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ انڈے میں کاربوہائڈریٹ (چکنائی) نہیں ہوتی، جس سے جسم موٹا ہوتا ہے۔ جو لوگ مُٹاپے سے ڈرتے ہیں، وہ انڈے ڈٹ کر کھا سکتے ہیں۔

آدھا اُبلا ہُوا انڈا (ہاف بُوائلڈ) جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ سخت اُبلا ہوا (ہارڈ بوائلڈ) ثقیل ہوتا ہے اور دیر سے ہضم ہوتا ہے۔ ہاف بوائلڈ تین چار منٹ میں اور ہارڈ بوائلڈ آٹھ دس منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔

اُبلے ہوئے انڈے کو بائیں ہاتھ میں سیدھا پکڑ کر اُس کے نوکیلے سرے پر آہستہ آہستہ چمچہ ماریے۔ چھلکا ٹوٹ جائے تو اُس کا اِتنا حصّہ اُتار لیجیے کہ چمچہ انڈے کے اندر داخل ہو سکے۔ اب نمک مرچ چھڑک کر کھایئے۔ اِس بات کا خیال رکھیے کہ سفیدی یا زردی کپڑوں پر نہ گرے۔ اگر غلطی سے گر جائے تو فوراً اُلٹی چھُری یا چاقو سے صاف کر دیجیے اور پھر ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیے۔ اِس سے کپڑے پر داغ نہیں پڑے گا۔ گرم پانی سے داغ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ گرم پانی اِستعمال نہ کیجیے۔

اُبلے ہوئے انڈے کچّے انڈوں میں مِل جائیں تو کس طرح پتا چلائیں گے کہ اُبلا ہوا کون سا ہے اور کچّا کون سا؟ انڈے کو میز پر چٹکی سے گھمایئے۔ لٹّو کی طرح گھومنے لگے تو اُبلا ہوا ہے ورنہ کچّا۔ دوسری بات یہ کہ اُبلے ہوئے انڈے کے چھلکے پر چمک نہیں ہوتی۔ تھوڑی پیلاہٹ آ جاتی ہے۔

Sharjeel Ahmed

ہندسے کس نے ایجاد کیے؟

ہندسے یا عدد (Numbers) کی ایجاد سے پہلے انسان انگلیوں پر حساب کتاب کرتا تھا (اب بھی اَن پڑھ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں)۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے مصریوں نے تصویری خط ایجاد کیا تو اُنھوں نے مختلف ہندسوں کے لیے مختلف تصویریں مقرر کیں۔ مثلاً وہ کاغذ پر رسّی کے لچھّے کی تصویر بناتے تو اِس کا مطلب ہوتا 100 ۔ ایک کنول کے پھول کے معنی تھے 1,000 اور مینڈک کا مطلب تھا 100,000 ۔ اِس طرح وہ کام تو چلا لیتے تھے لیکن جمع، تفریق، تقسیم کرتے وقت بہت مشکل پیش آتی تھی۔ ذرا آپ تین کنول کے پھولوں کو دو مینڈکوں میں سے تفریق کر کے دیکھیے!

تقریباً اُسی زمانے میں یونان کے لوگ ہندسوں کے لیے یونانی زبان کے حروف استعمال کرتے تھے، اور روم کے باشندے بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اُن کے ایک سے دس تک ہندسے اِس طرح تھے: I II III IV V VI VII VIII IX X۔ رومن ہندسوں کی یہ علامتیں اب صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے ہندو ریاضی کے موجد ہیں، اور یہ ہندسے جو اَب ساری دُنیا استعمال کرتی ہے، اُنھی کی ایجاد ہیں۔ آج سے تقریباً 1,200 سال پہلے عربوں نے یہ ہندسے ہندوؤں سے سیکھے، اور جب 711ء میں اُنھوں نے (یورپ کا ایک مُلک) اسپین فتح کیا اور وہاں یُونی ورسٹیاں اور کالج قائم کیے تو یورپ کے لوگوں نے اُن سے دوسرے عُلوم کے ساتھ ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی، اور اس طرح اِن ہندسوں کا تمام یورپ میں رواج ہو گیا۔ چُوں کہ یورپ والوں نے یہ ہندسے عربوں سے سیکھے تھے، اِس لیے وہ اِنھیں عربی ہندسے (Arabic Numerals) کہتے تھے (اور اب بھی کہتے ہیں)۔

ریاضی میں صِفر یا زیرو (0) بھی ہندوؤں ہی کی ایجاد ہے۔ وہ اِسے "شُونیہ" کہتے ہیں۔ (شُونیہ کا مطلب ہے "خالی")۔ عربوں نے اِسے صِفر کا نام دیا اور یورپ کے لوگوں نے اِسے بگاڑ کر سائفر (Cipher) کر دیا۔ صِفر کی ایجاد سے حساب کتاب میں بہت آسانی ہو گئی، اور لوگ لاکھوں، کروڑوں، اربوں اور کھربوں تک گننے لگے۔

یہ صِفر بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اِسے کسی ہندسے کے بائیں طرف لگا دیں (مثلاً 02) تو اِس کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔ لیکن اِسے ہندسے کے دائیں طرف لگا دیں تو اِس کی قیمت 10 گُنا بڑھ جائے گی (مثلاً 20)۔ اور اگر اِس کے آگے صِفر لگاتے جائیں تو آپ ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، ارب، دس ارب، کھرب، دس کھرب تک گِن سکتے ہیں۔

نیچے ہندی، عربی اور یورپی ہندسے دیے گئے ہیں۔ اِن سے آپ کو معلوم ہو گا کہ عربوں اور یورپ کے لوگوں نے، اپنی سہُولت کے لیے، اِن میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں:

ہندی	٤	٥	٦	٧	٨	٩	١٠	١١	١٢
عربی	٩	٨	٧	٦	٥	٤	٣	٢	١
یورپی	9	8	7	6	5	4	3	2	1

اُردو میں عربی ہندسے ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ صِرف چار اور سات کے ہندسوں کو تبدیل کیا گیا ہے۔ اُردو میں اِن ہندسوں کی شکل اِس طرح ہے: ۴۔ ۷۔

چھالا کیسے پڑتا ہے؟

اگر آپ کوئی بہت گرم چیز چھُو لیں تو آپ کی جلد پر بُلبُلا سا بن جائے گا، جس کے اندر پانی ہو گا۔ اِسی کو چھالا، آبلہ یا پھپھولا کہتے ہیں۔

نئے اور سخت جُوتے کی رگڑ سے بھی پیر کی اُنگلی یا ایڑی میں چھالا پڑ جاتا ہے۔ اُس کے اندر جو پانی ہوتا ہے، اُسے لِسف (Lymph) کہتے ہیں۔ یہ لِسف جلی ہوئی جلد کی حفاظت

کرتا ہے۔

چھالا دراصل ایک طرح کا حفاظتی خول ہوتا ہے جو جِلد کے نیچے باریک نسیجوں (Tissues) میں جراثیم کو داخل ہونے سے روکتا ہے، اِس لیئے چھالے کو پھوڑنا نہیں چاہیئے۔ چند روز بعد آپ ہی آپ مُرجھا کر ختم ہو جائے گا۔

پرندوں کے انڈے رنگ دار کیوں ہوتے ہیں؟

جنگلی پرندوں کے انڈوں کے رنگ اُنہیں دُشمنوں سے بچاتے ہیں۔ زمین پر گھونسلے بنانے والے پرندوں کے انڈے خاکی ہوتے ہیں۔ یہ زمین پر پڑے ہوئے آسانی سے نظر نہیں آتے، اِس لیے دُشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

درختوں پر گھونسلے بنانے والے پرندوں کے انڈے ہلکے نیلے یا ہلکے سبز ہوتے ہیں، اِس لیے سبز پتّوں کے جُھرمٹ میں دِکھائی نہیں دیتے۔

وہ پرندے جو بہُت بلندی پر یا تنگ وتاریک سُوراخوں میں انڈے دیتے ہیں، اُن کے انڈے سفید ہوتے ہیں۔ یہ چُوں کہ دُشمن کی پہنچ سے دُور ہوتے ہیں، اِس لیے قُدرت نے اِنہیں رنگ دار نہیں بنایا۔

کیا تمام دُودھ ایک جیسے ہوتے ہیں؟

اِنسان جانوروں کا دُودھ، غِذا کے طور پر، ہزاروں سال سے اِستعمال کر رہا ہے، اور مُختلف مُلکوں میں مختلف جانوروں کا دودھ اِستعمال کیا جاتا ہے۔

ہم، عام طور پر، گائے بھینس اور بکری کا دودھ اِستعمال کرتے ہیں۔ گائے اور بکری کا کم اور بھینس کا زیادہ۔ یورپ اور امریکا میں بھینس نہیں ہوتی۔ وہاں کے لوگ گائے کا دودھ اِستعمال کرتے ہیں۔ صرف اِسپین میں زیادہ تر بھیڑوں کا دودھ اِستعمال کیا جاتا ہے۔ عرب کے خانہ بدوش لوگ (بدُو) اُونٹنی کا دودھ پیتے ہیں۔ مِصر میں بھینس دودھ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ شمالی یورپ کے ایک عِلاقے، لیپ لینڈ، کے لوگ رینڈیئر کا، جنوبی امریکا کے ملک پیرو کے باشندے "لاما" کا اور تبت کے لوگ "یاک" کا دودھ اِستعمال کرتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام دودھ ایک جیسے ہوتے ہیں؟ اِس کا جواب ہے "نہیں۔" ہر جانور ایسا دودھ پیدا کرتا ہے جو اُس کے بچّوں کے لیے موزُوں ہو۔ گائے کے دودھ میں، اِنسان کے دودھ کے مُقابلے میں، شکر کم، نمک کچھ زیادہ اور پروٹین چار گُنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ دودھ گائے کا بچّہ تو آسانی سے ہضم کر سکتا ہے، لیکن اِنسان کے بچّے کو اِسے ہضم کرنے میں شروع شروع مُشکل پیش آتی ہے۔ لیکن چُوں کہ گائے کا دودھ اِنسان کے دودھ سے کافی مِلتا جُلتا ہے، اِس لیے اِنسان کا بچّہ جلد اِس کا عادی ہو جاتا ہے۔

اگرچہ مُختلف جانوروں کا دودھ مُختلف ہوتا ہے، پھر بھی اِن سب میں چربی، پروٹین، نِشاستہ اور معدنی اَجزا تھوڑی بہُت مِقدار میں ضرور پائے جاتے ہیں، اور یہ سب چیزیں صِحت وتن دُرستی کے لیے بہُت ضروری ہیں۔

کہتے ہیں دودھ ایک مکمّل غِذا ہے۔ لیکن اِس کا فائدہ اُس وقت دوگُنا ہو جاتا ہے جب اِسے کسی دوسری غِذا (روٹی، پھل، سبزی) کے ساتھ اِستعمال کیا جائے (س۔ ل)۔

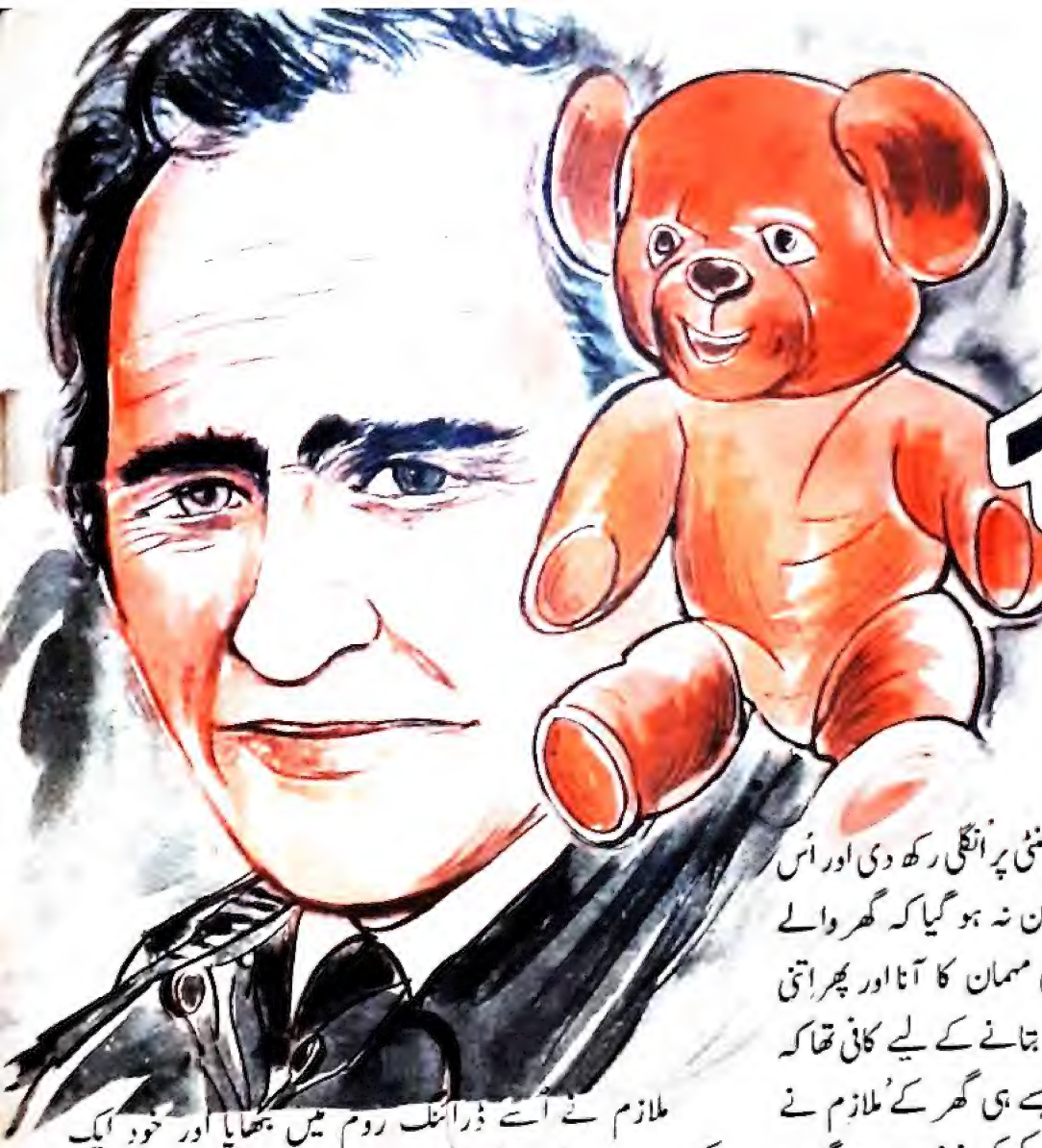

Sharjeel Ahmed

غدّار

ابن بلوچ

دروازے پر پہنچتے ہی اُس نے گھنٹی پر اُنگلی رکھ دی اور اُس وقت تک نہیں اُٹھائی جب تک یقین نہ ہو گیا کہ گھر والے جاگ گئے ہیں۔ اِتنی رات گئے کسی مہمان کا آنا اور پھر اِتنی ڈھٹائی سے گھنٹی بجانا گھر والوں کو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ آنے والا عام آدمی نہیں ہے۔ جیسے ہی گھر کے مُلازم نے دروازہ کھولا، وہ آنے والے کی شکل دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اُس نے ملازم کو سوال کرنے کی بھی مُہلت نہ دی اور بولا "مسٹر ڈی جون سے کہو کہ کمانڈر زیفان آیا ہے اور اُن سے فوراً مِلنا چاہتا ہے۔"

ملازم نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند منٹ بعد اَدھیڑ عُمر کا ایک شخص گاؤن پہنے آنکھیں ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا اور آنے والے کو دیکھ کر حیرت سے بولا "کمانڈر زیفان! آپ اور اِس وقت؟ خیریت تو ہے؟"

یوگو سلاویہ جنوب مشرقی یورپ کا ایک مُلک تھا ("تھا" اِس لیے کہ اب اِس مُلک کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہیں) اِس کے 6 صوبے تھے جن میں "سربیا" سب سے بڑا اور "بوسنیا" سب سے چھوٹا تھا۔ بوسنیا میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایک سال پہلے یوگوسلاویہ کے کئی صوبے اُس سے الگ ہو گئے۔ بوسنیا کے مسلمانوں نے بھی آزادی کا اِعلان کر دیا اور بوسنیا میں اپنی ایک آزاد و خود مُختار اِسلامی حکومت قائم کر لی۔ اِس پر سربیا کی فوجوں نے بوسنیا پر حملہ کر دیا، اور اُس کے کئی عِلاقوں پر قبضہ کر کے ہزاروں مسلمانوں کو ہلاک اور ہزاروں کو قیدی بنا لیا۔ دونوں مُلکوں میں جنگ جاری ہے اور اقوامِ مُتحدہ اِن میں صلح کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔

سربیا کی فوجوں نے چاروں طرف سے بوسنیا کو گھیرے میں لے لیا ہے، اور وہاں خشکی کے راستے اقوامِ مُتحدہ کی اِمداد پہنچنے نہیں دے رہی ہے۔ اِن گھِرے ہوئے مسلمانوں کے لیے ہوائی جہازوں کے ذریعے خوراک، دوائیں اور دوسرا سامان گرایا جا رہا ہے۔ یہ کہانی (غدّار) اِبنِ بلوچ نے سربیا اور بوسنیا کی اِسی جنگ کے پس منظر میں لکھی ہے۔ (ایڈیٹر)

"مسٹر ڈی جون، میں اِس وقت یہ امانت آپ تک پہنچانے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے جیب سے ایک پیکٹ نکالا اور ڈی جون کے حوالے کر دیا۔ اِس کے بعد اُس نے ڈی جون سے اجازت لی اور تیزی سے واپس چلا گیا۔

مسٹر ڈی جون سربیا کی فوجی لیبارٹری کا سائنس دان تھا۔ اُس نے اپنے کمرے میں جا کر بے چینی سے پیکٹ کھولا تو اندر سے ایک کھلونا نُما پستول نکلا۔ اُس کے ساتھ ایک کاغذ بھی تھا۔ جس میں لکھا تھا:۔

"مسٹر ڈی جون، یہ پستول جو بہ ظاہر کھلونا معلوم ہوتا ہے، امریکا کا بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ کھلونا نہیں ہے۔ ایک خطرناک بم ہے۔ جیسے ہی اِس کا ٹریگر دبایا جائے گا، یہ دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اِس کے قریب موجود تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ آپ کے حوالے یہ اِس لیے کیا گیا ہے کہ آپ اِسی وقت اِسے اپنی لیبارٹری میں جا کر دیکھیں۔ آپ کو ٹھیک اِسی طرح کے بُت سے بم بنانے ہیں۔ ہم یہ بم بچّوں کے مُختلف کھلونوں میں فٹ کر دیں گے اور پھر یہ کھلونے اقوامِ مُتّحدہ کی اِمداد کی آڑ میں بوسنیا کے عِلاقوں میں گرائے جائیں گے۔ بوسنیا کے مسلمان اِنھیں کھلونا سمجھ کر اُٹھالیں گے تو یہ اُن کے لیے ہلاکت کا پیغام بن جائیں گے۔ یہ کام چُوں کہ اِنتہائی خُفیہ تھا، اِس لیے آپ کو اِس وقت گھر پر زحمت دی گئی ہے۔"

پیغام پڑھ کر ڈی جون کے ماتھے پر ناگواری کی شِکنیں پڑ گئیں۔ لیکن وہ تو حکم کا غلام تھا۔ اُس نے اپنی صلاحیتیں ملک و قوم کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ اُسے جو حکم ملتا، وہ بے چُون و چرا اُس پر عمل کرتا۔ اِس وقت بھی اُس کے ذہن میں اُبھرنے والے سوال شور مچاتے رہ گئے اور وہ کھلونا پستول پکڑے اپنی ذاتی لیبارٹری کی طرف چل پڑا۔

لیبارٹری میں اُس کو کام کرتے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا کیوں کہ وہ اُس پستول نما کھلونے میں رکھے ہوئے بم کو سمجھ چکا تھا۔ اُس نے ایک کاغذ پر جلدی جلدی سرکٹ بنایا، چند سطریں لکھیں، پستول میں موجود ننھے سے بم کو احتیاط سے جیب میں ڈالا، چند پُرزے اُٹھائے اور اپنے بچّوں کے کمرے کی طرف چل پڑا جہاں بہت سے کھلونے موجود تھے۔ وہ اِس بم کو کسی کھلونے میں لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔

بچّوں کے کمرے میں آکر اُس نے یہ بم ایک بھالو کی شکل کے کھلونے میں فِٹ کر دیا۔ بھالُو کی دُم ہِلانے سے بم چل سکتا تھا۔ وہ اپنی مہارت پر دل ہی دل میں مُسکرا دیا۔ اُس نے اپنا کام مکمّل کر لیا تھا۔ وہ اِطمینان سے اپنے کمرے میں گیا، بھالُو کو میز پر رکھا، اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب اُس کو اپنے دونوں بچّوں کے چیخنے چِلاّنے کی آواز سُنائی دی۔ اُس کی آنکھوں سے نیند اُسی طرح بھاگ گئی جس طرح کل رات کمانڈر زیفان کو دیکھ کر بھاگی تھی۔ بھالو کھلونا، جس میں اُس نے بم لگایا تھا، اُس کے پانچ سالہ بیٹے کے ہاتھ میں تھا، اور اُس کا تین سالہ بیٹا اپنے بڑے بھائی سے کھلونا لینے کی ضِد کر رہا تھا۔ اُن کی ماں بچّوں کو ڈانٹنے کے ساتھ ساتھ اُن کے باپ کو بھی کوس رہی تھی کہ اُسے بچّوں کے کھلونے چُرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگلا لمحہ تو ڈی جون کے لیے اِنتہائی خوف ناک ثابت ہُوا۔ اُس کے دونوں بیٹے اب ایک دوسرے سے گُتھم گُتھا ہو چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی لمحے کھلونا پھٹ سکتا ہے جس سے اُس کا ہنستا بستا گھر کھنڈر بن جائے گا۔ وہ پوری قوّت سے چیخا:

"زینوف! رُک جاؤ!!"

اُس کے بچّے اُس کی چیخ سُن کر سہم گئے۔ بیوی نے غصّے سے اُس کی طرف دیکھا اور بولی:

"یہ آپ کو رات کے وقت کھلونوں سے کھیلنے کا شوق کب سے ہو گیا ہے؟ زینوف اور گاف صبح سے شور مچا رہے تھے کہ اُن کی الماری سے اُن کا بھالُو غائب ہے۔ وہ اُسے ڈھونڈتے ہوئے آپ کے کمرے میں آئے تو یہ آپ کی میز پر رکھا تھا۔"

مسٹر ڈی جون کی بیوی کچھ زیادہ ہی باتونی تھی۔ وہ بولتی جا رہی تھی، مگر ڈی جون اپنے بیٹوں کو خوف زدہ نظروں سے

دیکھ رہا تھا جو بھالو کے لیے لڑ رہے تھے۔ اور پھر جیسے ہی چھوٹے گاف نے بھالو کی دُم پر ہاتھ رکھا۔ ڈی جون اِسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا اور دونوں بچّوں کے پاس جا پہنچا۔ مگر ننّھا گاف باپ سے بھی زیادہ تیز نکلا۔ وہ بھالو کو لے کر پلنگ کے نیچے گھُس گیا۔ ڈی جون نے پلنگ کے نیچے گھُسنے کے بجائے پوری قوّت سے پلنگ اُلٹا دیا۔

ننّھا گاف حیرت اور خوف سے باپ کی طرف دیکھنے لگا، مگر بھالو اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈی جون اُس سے بھالو چھینتا تو بم چل سکتا تھا۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"گاف بیٹے، بھالو مجھے دے دو۔ شاباش!"

معلوم نہیں اُس کے کہنے کا انداز کیسا تھا، گاف نے بھالو اُسے دے دیا۔

ڈی جون نے بیٹے کو گلے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ سوچ رہا تھا "کیا بوسنیا کے بچّے، بچّے نہیں؟ کیا اُن کو جینے کا حق نہیں ہے؟ کیا وہ اپنے ماں باپ کو پیارے نہیں ہیں؟ کیا وہ اِنسان کے بچّے نہیں ہیں؟ آخر اُن کا کیا قصور ہے؟ اُن کو کس جُرم کی سزا میں مارا جا رہا ہے؟

اِن سوالوں کا اُس کے پاس ایک ہی جواب تھا، اور اُس نے وہی جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنے مُلک کا غدّار اور ضمیر کا وفادار بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اقوامِ مُتّحدہ کی طرف سے ہوائی جہازوں کے ذریعے بوسنیا کے عِلاقوں پر خوراک اور عام اِستعمال کی چیزیں گرائی جا رہی تھیں۔ سربیا کے درندے اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے طیّاروں کے ذریعے بوسنیا کے بچّوں کے لیے کھلونے گرا رہے تھے۔ کمانڈر زیفان اور اُس کے ساتھی سمجھ رہے تھے کہ یہ کھلونے بم ہیں لیکن ڈی جون جانتا تھا کہ یہ بم نہیں، کھلونے ہیں۔ اِن میں بارُود کی جگہ چاکلیٹ، بادام اور چُونگ گم بھرے ہوئے ہیں۔

خدا بہت کارساز ہے۔ وہ دُشمنوں میں دوست پیدا کر دیتا ہے!

Sharjeel Ahmed

... سلام کہتی ہیں

شکیل زاہد

لاہور - 10 دسمبر 1971ء - دس بجے صبح

کیپٹن عبدُالوحید کی جیپ شامی روڈ پر سفید رنگ کی ایک وسیع عمارت میں داخل ہوئی تو گیٹ پر کھڑے سپاہی نے کھٹ سے سیلُوٹ کی۔ کیپٹن نے سر کے اشارے سے سیلُوٹ کا جواب دیا اور جیپ اندر لے گیا۔

اندر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کیپٹن وحید نے اپنی جیپ ایک درخت کے پاس کھڑی کی اور عمارت کی جانب چل پڑا۔ صبح کے دس بج چکے تھے لیکن بادلوں کی وجہ سے سورج نظر نہیں آرہا تھا۔ بڑے دروازے کے اُوپر پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ کیپٹن وحید نے ایک نظر پرچم پر ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

دروازہ ایک بڑے ہال میں کُھلتا تھا جس میں دونوں جانب کمرے تھے۔ ذرا آگے جا کر اُوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ہال میں فوجی جوان اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ چند ایک نے کیپٹن وحید کو پہچان کر مسکرا کے سلام کیا۔ کیپٹن وحید نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ بھارت نے 10 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ 3 دسمبر 1971 کو بھارتی فوجیں مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی چڑھ دوڑیں اور یہاں بھی شدید لڑائی ہو رہی تھی۔

کیپٹن وحید سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک پتلی سی راہ داری تھی جس کے ایک جانب کئی کمرے تھے۔ کیپٹن وحید ایک دروازے کے سامنے رُک گیا۔ دروازے پر بریگیڈیر محمّد حسن کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وحید نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ "آجاؤ" اندر سے آواز آئی۔

کیپٹن وحید دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک بڑی سی میز تھی۔ میز پر فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا اور ایک فائل پر جُھکا بریگیڈیر محمّد حسن کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس نے وحید کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یُوں ہی لکھتے لکھتے بولا "آؤ، کیپٹن۔ بیٹھو۔"

وحید حیرت زدہ سا ایک کرُسی پر بیٹھ گیا اور بولا "سر، آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہُوں؟"

بریگیڈیر حسن نے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھایا۔ اُس کی کلائی پر

سفید رنگ کی گھڑی چمک رہی تھی۔ "دس بجے صرف تمہیں ہی آنا تھا" وہ بولا۔ پھر فائل بند کر کے ایک جانب رکھ دی اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا "آج میں نے تمہیں ایک اہم کام کے سلسلے میں بُلایا ہے۔ یہ کام مُشکل اور جان جوکھوں کا ہے۔ کرنا پسند کرو گے؟"

"سر، آپ حکم کریں" کیپٹن عبدُالوحید نے کہا۔

"پرسوں واہگا سیکٹر پر ہمارے تین افسر بھارتی فوجیوں نے گرفتار کر لیے۔ وہ وہاں اُن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے گئے تھے کہ اچانک دشمن کے ٹینک کا ایک گولا اُن کے قریب آگرا۔ دھماکے سے وہ بے ہوش ہو گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ہماری اِطلاع کے مُطابق اُنہیں ویرووال میں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں رکھا گیا ہے۔ ایک دو دنوں میں اُن کو امرتسر پہنچا دیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُنہیں چھڑا کے لے آؤ۔ مگر یہ کام تیزی اور رازداری سے کرنا ہو گا۔ اگر وہ لوگ امرتسر پہنچا دیے گئے تو پھر اُن کی رِہائی بہت مُشکل ہو گی — بولو! کر سکو گے یہ کام؟"

"سر، میرے ساتھ کتنے آدمی جائیں گے؟" کیپٹن وحید نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔ یہ کام تمہیں اکیلے کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، سر — میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔"

"گُڈ" بریگیڈیر حسن نے خوش ہو کر کہا "اب سُنو، تمہیں کیا کرنا ہے۔"

ویرووال واہگا سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر بھارتی سرحد کے اندر ہے۔ اِن دونوں کو ایک چھوٹی سی سڑک ملاتی ہے۔ واہگا سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر اِسی سڑک کے کنارے بھارتی فوج کا کیمپ لگا ہوا تھا اور فوج کے اِس دستے کی کمان کرنل ہری سنگھ کر رہا تھا۔ اُس نے گزشتہ چار دنوں میں کئی بار لاہور کی جانب بڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن پاکستانی فوج نے اُس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی اور اپنی اِس ناکامی کا غصّہ وہ اپنے ماتحتوں پر نکالا کرتا تھا۔ جو بھی سامنے آتا، اُسے ڈانٹ پھٹکار سُننا پڑتی۔

رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے ایک سپاہی نے ہری سنگھ کے خیمے کے سامنے آکر سیلُوٹ کی۔ کرنل میز پر ایک نقشہ پھیلائے بیٹھا تھا۔ سیلُوٹ کی آواز سُن کر اُس نے سر اُٹھایا تو سپاہی کو دیکھ کر اُس کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔

"کیا بات ہے؟ دیکھتے نہیں میں مصروف ہوں؟" وہ غُرایا۔

"سر، ہمارا ایک فوجی دشمن کی قید سے بھاگ آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے" سپاہی نے کہا۔

کرنل ہری سنگھ کے ماتھے کی شِکنیں اور گہری ہو گئیں۔ اُس نے کہا "اُسے اندر لے آؤ۔"

سپاہی ایڑیوں پر گھوما اور مارچ کرتا ہوا اندھیرے میں گُم ہو گیا۔ کرنل ہری سنگھ گہری سوچ میں غرق تھا۔ اُس کی سوچ قدموں کی چاپ سے ٹوٹی۔ چار سپاہی ایک شخص کو جو بھارتی فوج کی وردی پہنے تھا، لے کر اندر داخل ہوئے۔ کرنل کی نظر سب سے پہلے قیدی کے کاندھوں پر پڑی۔ وہاں تین ستارے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ کیپٹن ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قیدی کے پاس گیا۔ قیدی نے اُسے سیلُوٹ کی۔

کرنل نے دیکھا کہ قیدی کے چہرے پر جابجا خراشیں لگی ہوئی ہیں۔ کپڑے بھی مٹّی اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں تنکے اور پتّے پھنسے ہوئے تھے۔ بایاں ہاتھ زخمی تھا اور اُس پر رومال بندھا ہوا تھا۔ زخم سے رِسنے والے خون نے رومال کو سُرخ کر دیا تھا۔ کرنل کچھ دیر قیدی کا جائزہ لیتا رہا، پھر کڑک کر بولا "تمہارا نام؟"

"کیپٹن کرِشن ورما" قیدی نے کہا۔

"شناختی کارڈ؟" کرنل نے پوچھا۔

"سر، وہ تو گرفتار کرنے کے بعد پاکستانی فوج نے لے لیا تھا۔"

"ہوں! تم کہاں سے گرفتار ہوئے تھے؟"

"ہماری یونٹ جلال آباد کے محاذ پر ہے۔ اِس یونٹ کے 30 جوانوں کو، جن میں میں بھی شامل تھا، حکم ملا کہ وہ اٹاری جائیں جہاں پاکستانی فوج کی ایک بریگیڈ موجود ہے۔ میجر رمیش دت ہمارے کمانڈر تھے اور ہمارا مشن پاکستانی بریگیڈ پر شب خون مارنا تھا۔ ابھی ہم دشمن سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تھے کہ نہ جانے کہاں سے پاکستانی فوجی آدھمکے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ لوگ وہاں چھپے ہوں گے"

"بڑا ہی گدھا تھا تمہارا افسر" کرنل نے غصّے سے کہا "اُسے میجر کس نے بنا دیا؟ اِتنی سی بات بھی اُسے معلوم نہ تھی؟"

"حملہ بڑا اچانک تھا، سر ــــ ہم سنبھل نہ سکے ــــ کچھ مارے گئے اور 20 کے قریب گرفتار ہو گئے۔"

"پھر؟ تم کیسے بچے؟"

"پاکستانی فوجی ہمیں ایک ٹرک میں ڈال کر لاہور لے جا رہے تھے کہ اچانک ٹرک کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے۔ میں نے پردہ اُٹھایا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ اُن لوگوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے۔ یہ چوٹ چھلانگ لگانے سے لگی تھی۔" اُس نے ہاتھ کی چوٹ کی طرف اِشارہ کیا "میں قلابازیاں کھاتا ہُوا سڑک کے کنارے درختوں کے پیچھے چلا گیا اور ایک گھنٹے کی کوشش سے اپنے ہاتھ اور پاؤں آزاد کرائے۔ اِس کے بعد چھُپتا چھُپاتا واہگا پہنچا اور رات کے اندھیرے میں یہاں آگیا۔"

"تمہارے باقی ساتھی؟" کرنل نے کُرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میرے ساتھ کسی نے چھلانگ نہیں لگائی تھی۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" کرنل نے پوچھا۔

"میں اپنی یونٹ میں واپس جانا چاہتا ہوں" کیپٹن کرِشن ورما نے کہا "آپ مجھے امرتسر پہنچا دیں۔ وہاں سے میں خود جلال آباد چلا جاؤں گا۔"

کرنل نے کچھ سوچتے ہوئے سرہلایا اور پھر بولا "آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ خیمے سے باہر نکل گیا۔

کیپٹن کرِشن ورما بھی اُس کے پیچھے پیچھے نکلا۔ دونوں کچھ دور جا کر ایک خیمے میں داخل ہو گئے۔ اُس خیمے میں ایک چھوٹا سا ٹیلی فون ایکسچینج اور چند وائرلیس سیٹ رکھے تھے۔ زمین پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کرنل سیدھا ٹیلی فون ایکسچینج پر بیٹھے آدمی کے پاس گیا اور بولا:

"جلال آباد یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے بات کراؤ۔"

آپریٹر نے تیزی سے نمبر ڈائل کرنے شروع کر دیے۔ کیپٹن غور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد لائن مل گئی۔ جب کمانڈنگ آفیسر لائن پر آیا تو آپریٹر نے ریسیور کرنل کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو! کرنل ہری سنگھ بول رہا ہوں۔ ویروال اور واہگا کے درمیان سے" کرنل نے کہا "ہمیں پتا لگا ہے کہ کل رات آپ کے کچھ جوان پاکستانی فوج کے ہتھے چڑھ گئے۔"

"جی ہاں، دُرست سُنا ہے آپ نے۔"

"آپ کی یونٹ میں کوئی کیپٹن کرشن ورما بھی ہیں؟" کرنل نے کیپٹن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، وہ بھی اُنہی لوگوں میں شامل تھے۔"

"اچھا، اچھا" کرنل نے سرہلایا "وہ فرار ہو کر ہمارے پاس پہنچ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُنہیں دوبارہ اُن کی یونٹ میں بھجوا دیا جائے۔ جی ہاں، زخمی ہیں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ اچھا، آپ خود ہی کہہ دیں۔" کرنل نے ریسیور کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔

کیپٹن کرشن ورما آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ریسیور لے کر کان سے لگا لیا "کیپٹن کرشن ورما، سر۔"

"تم کیسے بھاگ آئے، کیپٹن؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے، سر، آکر سناؤں گا۔"

"کرنل نے بتایا ہے کہ تم زخمی ہو۔"

"جی سر، لیکن زیادہ نہیں۔ میں کب رپورٹ کروں، سر؟"

"تیرہ کی صبح، ساڑھے سات بجے۔" یہ کہہ کر کمانڈنگ آفیسر نے ریسیور رکھ دیا۔

کیپٹن کرشن ورما نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر کرنل ہری سنگھ سے کہا "میرا خیال ہے کہ میں آج رات ہی امرتسر روانہ ہو جاؤں۔ وہاں چند دن آرام کر کے یونٹ میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ کل صبح چلے جانا" کرنل نے کہا۔

"سر، وہاں میرا گھر ہے۔ اپنے والدین سے مل لوں گا۔"

"اوکے" کرنل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "جیپ تمہیں امرتسر چھوڑ آئے گی۔ آؤ، میرے ساتھ۔" دونوں باہر نکل گئے۔

جب کیپٹن کرشن ورما امرتسر پہنچا تو اُس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اُس نے جیپ کو ایک مکان کے سامنے رُکوایا اور مکان کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ پھر مُڑ کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس انتظار میں تھا کہ کیپٹن اندر چلا جائے تو میں جاؤں۔ کیپٹن نے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔ اُس نے جیپ گیئر میں ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ کیپٹن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلی سُنسان تھی۔ اُس نے جُراب میں سے امرتسر کا نقشہ اور بٹوا نکالا۔ بٹوے میں کیپٹن کرشن ورما کا شناختی کارڈ تھا۔ اُس نے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر نقشے کا جائزہ لیا اور پھر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ اُسے ہر حال میں آج رات ویرووال پہنچنا تھا۔

امرتسر سے ویرووال تقریباً 50 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کیپٹن کی بس رات کے سوا ایک بجے ویرووال روانہ ہوئی اور ٹھیک سوا دو بجے وہاں پہنچ گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں چھاؤنی تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ کیپٹن نے چھاؤنی کے قریب پہنچ کر دوسری جُراب سے ایک پولی تھین کا لفافہ نکالا۔ اُس میں ایک خط تھا، جس کے نیچے بھیجنے والے کے نام اور دستخط کی جگہ خالی تھی۔ کیپٹن نے وہاں کرنل ہری سنگھ کے دستخط کیے اور اُس کے نیچے بریکٹ میں اُس کا نام لکھ دیا۔ اس کے بعد اُس نے خط تہ کر کے پتلون کی جیب میں رکھا اور سیدھا چھاؤنی جا پہنچا۔

دروازے پر موجود سپاہی نے اُسے دیکھ کر سیلوٹ کی۔ اُس نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ چھاؤنی کے اندر ہر طرف خیمے لگے ہوئے تھے۔ کچھ خیموں کے باہر سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ رات کے ڈھائی بجے وہاں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ یہ بات کیپٹن کے لیے فائدہ مند تھی۔ اُس نے رُک کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ایک خیمے سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سیدھا اُس خیمے کی جانب بڑھا اور کپڑا اُٹھا کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔

خیمے میں تین لیفٹیننٹ اور دو سب لیفٹیننٹ بیٹھے تھے۔ ایک طرف ایک کیپٹن لیٹا ہُوا تھا۔ کیپٹن کو دیکھ کر اُن کے قہقہے ایک دم رُک گئے۔

"کیپٹن کرشن ورما" کیپٹن نے اپنا تعارف کرایا "کمانڈنگ آفیسر کہاں ہیں؟"

پانچوں جوان کھڑے ہو گئے۔ ایک لیفٹیننٹ نے آگے بڑھ کر اُسے سیلوٹ کی اور بولا "لیفٹیننٹ رمیش چوہان، سر۔ کمانڈنگ آفیسر سو رہے ہیں۔"

"اُن کی جگہ کون کام کر رہا ہے؟" کیپٹن نے پوچھا۔

"میجر واسودت۔"

"میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لیفٹیننٹ رمیش چوہان کیپٹن کو لے کر ایک اور خیمے کی طرف بڑھا، جس کے باہر ایک سپاہی پہرا دے رہا تھا۔ رمیش کو دیکھ کر اُس نے سیلوٹ کی۔ رمیش کیپٹن کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ خیمے کے اندر میجر واسودت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

رمیش اندر داخل ہوا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ رمیش اور کیپٹن نے اُسے سیلوٹ کی۔

"کیپٹن کرِشن ورما" کیپٹن نے کہا "مجھے کرنل ہری سِنگھ نے بھیجا ہے۔ آپ کے پاس تین قیدی ہیں۔ مجھے اُن سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"تمہارا شناختی کارڈ؟" میجر نے کہا۔

کیپٹن نے بٹوے میں سے شناختی کارڈ نکال کر میجر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چند لمحے کارڈ دیکھتا رہا۔ اگر یہ دن کا وقت ہوتا اور میجر پوری طرح چوکس ہوتا تو شاید اُسے پتا چل جاتا کہ کارڈ پر تصویر بعد میں لگائی گئی ہے۔ مگر رات کے پونے تین بجے وہ نیند میں تھا۔ اُس نے کارڈ دیکھ کر کیپٹن کو واپس کر دیا اور کہا "کرنل ہری سِنگھ کا خط؟"

کیپٹن نے خط نکال کر میجر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس نے ایک نظر خط پر ڈالی، اور بولا "چلو، میرے ساتھ۔"

"آپ تکلیف نہ کریں، سر" کیپٹن نے کہا "لیفٹیننٹ رمیش مجھے لے جائے گا۔"

میجر بھی شاید یہی چاہتا تھا۔ اُس نے خوش ہو کر کہا "ٹھیک ہے۔ رمیش، اِنہیں لے جاؤ۔"

دونوں نے میجر کو سیلوٹ کی اور خیمے سے باہر نکل گئے۔

قیدیوں کا خیمہ فوجیوں کے خیمے سے الگ تھلگ تھا۔ اِس خیمے کے باہر چار سپاہی پہرے پر تھے۔ کیپٹن نے رمیش کو باہر ہی سے رُخصت کر دیا اور خود اندر داخل ہو گیا۔

خیمے کے اندر تینوں پاکستانی قیدی بندھے پڑے تھے۔ اُن میں دو کیپٹن تھے اور ایک میجر۔ کیپٹن کو دیکھ کر اُن کے ماتھوں پر شِکنیں پڑ گئیں۔ وہ اُسے نہیں پہچانتے تھے۔ کیپٹن اُن کے قریب پہنچا اور بولا "میرا نام کیپٹن عبدُالوحید ہے۔ مجھے آپ لوگوں کو آزاد کرانے کا کام سونپا گیا ہے۔"

"یہ کوئی نئی چال ہے؟" میجر نے غُرا کر کہا۔

کیپٹن وحید نے ایک گہری سانس لی۔ اُسے یہ خیال تو آیا ہی نہ تھا کہ یہ لوگ بھی اُس پر شک کر سکتے ہیں۔ اُس نے کہا "مجھ پر شک نہ کریں۔ مجھے بریگیڈیئر محمد حسن نے بھیجا ہے۔ اُن کا تعلق پنجاب رجمنٹ سے ہے۔ آپ تینوں بھی تو اِسی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔"

اِس کے بعد وحید نے اُنہیں بتایا کہ اُنہیں کیا کرنا ہے۔ پھر اُس نے اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا چاقو کھولا اور اُن کی رسّیاں کاٹ دیں۔ اُس نے چاقو میجر کے حوالے کیا اور باہر نکل گیا۔

پہرے داروں نے اُسے سیلوٹ کی۔ وہ کچھ آگے بڑھا، پھر رُک گیا اور سپاہیوں سے کہا "تم میں سے ایک میرے ساتھ آئے۔ مجھے کمانڈنگ آفیسر کے خیمے میں جانا ہے۔"

ایک پہرے دار اُس کے ساتھ ہو لیا۔ خیمے کے اندر سے پاکستانی قیدی میجر اکرم یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر کیپٹن احمد کو اشارہ کیا۔ احمد نے چاقو سے خیمے کا پچھلا حصّہ چاک کر دیا۔ تینوں خیمے سے باہر نکلے اور گھوم کر پہرے داروں کے پیچھے پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکتے، وہ چیتوں کی طرح اُن پر جھپٹے۔ چند لمحوں بعد تینوں پہرے دار بغیر کوئی آواز نکالے ڈھیر ہو گئے۔ دوسری طرف وحید نے بھی چوتھے پہرے دار کی گردن کا منکا توڑ دیا تھا۔ تینوں افسروں نے جلدی جلدی پہرے داروں کے کپڑے پہنے اور اُنہیں اُٹھا کر خیمے کے اندر ڈال دیا۔

وحید نے چھاؤنی کا نقشہ ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ وہ ایسے راستے سے چلا جدھر لیفٹیننٹ رمیش یا میجر واسودت سے ٹکرانے کا امکان نہ ہو۔ دروازے کے قریب کھڑے ٹرکوں میں سے ایک ٹرک کے قریب جا کر وحید نے اُن تینوں کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور سیدھا ڈرائیور کے پاس پہنچا جو ٹرک کے پاس زمین پر بیٹھا اکیلا تاش کھیل رہا تھا۔ وحید کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور کھٹاک سے سیلوٹ کی۔

"بے وقوف!" وحید گرجا "میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم یہاں تاش کھیل رہے ہو؟"

"سر، مجھ سے تو کسی نے کہا ہی نہیں" ڈرائیور نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"بکو مت۔ ادھر لاؤ ٹرک کی چابی اور اپنے خیمے میں چلے جاؤ۔ ایک منٹ کے بعد تمہاری شکل نظر آئی تو شوٹ کر دوں گا۔"

ڈرائیور نے چابی نکال کر وحید کے ہاتھ میں تھمائی اور بھاگتا ہُوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وحید نے مُڑ کر اُن تینوں کو اشارہ کیا۔ میجر اکرم ٹرک میں وحید کے ساتھ بیٹھ گیا اور دونوں کیپٹن پیچھے چلے گئے۔ وحید نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

چھاؤنی کے دروازے پر موجود سپاہیوں نے ٹرک کو ہاتھ دیا۔ وحید نے ٹرک روک لیا۔ میجر نیچے جھک گیا جیسے کوئی گری ہوئی چیز اُٹھا رہا ہو۔ وحید کو دیکھ کر سپاہی نے سیلوٹ کی اور وحید نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔ جب وہ لوگ چھاؤنی سے باہر نکلے تو رات کے پونے چار بجے تھے۔ اب وحید کو ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ راتوں رات سرحد پار کر جائے۔

دسمبر کی رات تھی اور کڑکڑاتی سردی۔ اُنہیں تمام راستے کوئی نہ ملا۔ کرنل ہری سنگھ کا کیمپ بھی گزر گیا۔ واہگا کے پاس سرحد پر گنّے کے کھیت پاکستان اور بھارت کو الگ کرتے تھے۔ رانی کھیتوں سے ہو کر وہ آج رات بھارت میں داخل ہوا تھا اور اِنہی کی وجہ سے اُس کے چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ ہاتھ پر زخم اُس نے خود لگایا تھا۔ جب اُن کا ٹرک کھیتوں کے پاس پہنچا تو رات کا سناٹا اچانک ٹوٹ گیا۔

اُن کے پیچھے گولیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ دو تین گولیاں ٹرک پر بھی لگیں اور اُس کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ٹرک ڈولنے لگا۔ وحید نے آئینے میں دیکھا۔ پیچھے تین جیپوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

"لگتا ہے، اُن لوگوں کو پتا چل گیا ہے" وحید نے کہا "اب آپ میری بات غور سے سُنیں۔ میں ٹرک اِن کھیتوں میں اُتاروں گا اور اُسے ایک لمحے کے لیے روکوں گا۔ آپ تینوں چھلانگ لگا کر کھیتوں میں غائب ہو جائیں۔ کھیتوں کے پار پاکستان ہے۔"

"اور تم؟" میجر نے پوچھا۔

"بحث کرنے کا وقت نہیں ہے، سر" وحید نے کہا۔ "میرے سپرد جو کام کیا گیا ہے، وہ مجھے ہر حال میں کرنا ہے۔"

"لیکن ہم تمہیں ——" میجر کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اُسی

وقت ایک گولی نے ٹرک کے دوسرے ٹائر میں بھی سوراخ کر دیا۔ ٹرک بُری طرح ڈول رہا تھا۔ وحید نے بڑی مُشکل سے اُس کو سنبھالا۔

"سر، کھیت آ گئے ہیں" اُس نے کہا "اگر آپ نے ذرا سی دیر کی تو ہم چاروں مارے جائیں گے۔"

میجر نے ایک نظر وحید کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ ٹرک اُس وقت گنّے کے کھیت میں داخل ہو چکا تھا۔ وحید نے بریک لگائے۔ تینوں افسروں نے ٹرک سے چھلانگ لگا دی۔ وحید نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور ٹرک کو کھیتوں سے باہر نکال لیا۔ دشمن کی جیپیں اُس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔

چند منٹ چوہے بلّی کی یہ دوڑ جاری رہی۔ لیکن ٹرک جیپ کا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک جیپ اُس کے آگے آ گئی اور اُس میں سوار ایک سپاہی نے ٹرک کی وِنڈ اِسکرین پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تین گولیاں وحید کے سینے میں اُتر گئیں۔ اُس نے مرتے مرتے ٹرک ایک درخت سے ٹکرا دیا۔ ٹرک اُلٹا، اُس نے قلابازیاں کھائیں اور اُس کی ڈیزل کی ٹنکی میں آگ لگ گئی۔ اگلے ہی لمحے ٹرک میں دھماکے سے آگ لگ گئی

کھیتوں میں موجود میجر اکرم اور اُس کے ساتھیوں نے دھماکا سُنا تو جان گئے کہ اُن کے ساتھی نے اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ٹرک سے اُٹھنے والے شُعلوں کی وجہ سے بھارتی فوجی اُس کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ وہ سمجھے کہ چاروں پاکستانی ہلاک ہو گئے ہیں۔

کھیت ختم ہوئے تو پاکستان آ گیا۔ تینوں افسروں نے بھارتی فوجیوں کی وردی اُتاری اور اپنی وردیاں پہن لیں جو وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

کچھ دُور جا کر جی ٹی روڈ آ گئی۔ وہ کچھ دیر ہی چلے تھے کہ ایک بس لاہور کی طرف جاتی نظر آئی۔ اُنہوں نے ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ فوجیوں کو دیکھ کر ڈرائیور نے بس روک لی۔ تینوں بس میں سوار ہو گئے۔

بس میں ریڈیو پر خبریں ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو جنگ کی صُورتِ حال بتائی جا رہی تھی۔ جب خبریں ختم ہوئیں تو ایک بلّی نغمہ شروع ہو گیا۔ نغمے کے یہ بول بس میں گونجے تو تینوں فوجیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں:

اے راہِ حق کے شہیدو، وفا کی تصویرو
تمہیں وطن کی ہَوائیں سلام کہتی ہیں

Sharjeel Ahmed

چٹ پٹے مسالے دار

کُڑی اور کوڑا

ہماری امّی پنجابی سمجھ تو لیتی ہیں لیکن ٹھیک سے بول نہیں سکتیں۔ ایک دفعہ ہمارے پڑوسیوں کے ہاں لڑکی ہوئی۔ وہ پنجابی ہیں۔ اُن کی ایک رشتے دار عورت ہمارے گھر آئی تو امّی نے پوچھا "بہن، کیا ہُوا؟" عورت بڑی مایُوسی سے بولی "کُڑی ہوئی اِے۔" امّی نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں، اللہ کُوڑا بھی دے دے گا۔" یہ سُن کر ہم سب بہن بھائی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ امّی کو یہ معلوم نہ تھا کہ پنجابی میں لڑکے کو مُنڈا کہتے ہیں۔

(منیرُالاِسلام صِدّیقی کراچی)

پپّو گُم ہو گئے

پپّو میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ وہ بہُت شریر ہے۔ میں آج آپ کو اُس کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔

ایک دن ہم اِسکول سے گھر آئے تو پتا چلا کہ کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ ہماری سِٹّی گُم ہو گئی، کیوں کہ مہمانوں کی وجہ سے ہمیں بازار کے چار پانچ چکّر لگانے پڑتے تھے۔

خیر صاحب، اللہ اللہ کر کے مہمان گئے اور ہم کھانا کھانے بیٹھے تو باجی نے کہا "پپّو کہاں ہے؟"

ہم نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھا لیکن پپّو صاحِب غائب تھے۔ ہم کھانا چھوڑ کر اُن کی تلاش میں نکل گئے۔ قریباً دو گھنٹے ہم اُنہیں اُن کے دوستوں کے گھروں میں تلاش کرتے رہے اور آخر تھک ہار کر گھر آ گئے۔

گھر میں سب پریشان تھے۔ پاپا بھی دفتر سے آ چکے تھے۔ اُنھوں نے بھی کافی دوڑ دُھوپ کی لیکن پپّو کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔

آخر کار پاپا نے کہا "تھانے میں رپٹ لکھوانی چاہیئے۔"

اِس دوران میں مَیں سرونٹ کوارٹر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پپّو صاحِب سامنے بیٹھے کیاری کھود رہے ہیں۔ میں اُنہیں لے کر اندر آیا تو سب حیران ہو گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ پپّو کی مس نے بچّوں سے کہا تھا کہ سبزیاں مہنگی ہیں، اِس لیے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے گھروں میں سبزیاں کاشت کریں۔ پپّو صاحِب نے یہ سُنا تو آتے ہی کیاری میں بیج بونے شروع کر دیئے۔

(عامِر رضی صِدّیقی، اسلام آباد)

اُلٹی آنتیں گلے پڑیں

ہماری خالہ بہُت زندہ دل ہیں۔ ایک دفعہ ہم گرمیوں کی چُھٹّیوں میں اُن کے گھر گئے۔ اُنھوں نے چار کُتّے پال رکھے ہیں۔ ہمیں کُتّوں سے ازحد نفرت ہے۔ خالہ جان کو ہماری اِس نفرت کا پتا تھا۔ لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ہمیں کتّوں سے ڈر نہیں لگتا، کیوں کہ وہ نہ تو شیر ہیں اور نہ ہاتھی۔ بہُت خطرناک ہوئے تو ٹانگ پر ایک آدھ اِنجکشن ہی تو لگا دیں گے، جس کا توڑ ہم ڈاکٹروں کے اِنجکشن سے کرا سکتے ہیں۔

خیر، خالہ نے ہمیں ڈرانے کے لیے ہمارے خالہ زاد بھائی کو چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور جوں ہی ہمیں نیند آئی، اُس نے کُتّے کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔ ہمیں سخت غصّہ آیا۔ بغیر سوچے سمجھے جُوتی اُٹھائی اور اُس کی کمر پر اِس زور سے جمائی کہ وہ اِنسان کی بولی بولنے لگا۔ بھید کھُلنے پر ہم تو دل میں خوب ہنسے مگر خالہ جان اور اُن کے صاحِب زادے بہُت شرمندہ ہوئے۔ (محمد اقبال ہما، وہاڑی)

تین کا پہاڑا

اِتوار کا دن تھا اور ٹی وی پر ہمارا پسندیدہ پروگرام آنا تھا۔ ہمارے ابّا جان ہم بہن بھائیوں کی پڑھائی کی طرف سے کچھ بے پروا سے رہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسی لہر آتی ہے کہ اچانک ہی حکم صادِر فرما دیتے ہیں کہ جب تک دو گھنٹے پڑھو گے نہیں، ٹی وی نہیں دیکھو گے۔

اُس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پروگرام میں صرف آدھا گھنٹا باقی تھا کہ ابّا جان کو ہماری پڑھائی کی فکر ہوئی۔ ہم تینوں بڑے پریشان ہوئے۔ آخر امّی کو ہماری حالت پر رحم آگیا اور اُنھوں نے اِتنی رِعایت کر دی کہ اِتنا اِتنا کام ختم کرنے پر ٹی وی دیکھ سکتے ہو۔

ہماری ایک چھوٹی بہن ہے جسے ہم پیار سے ننھّی کہتے ہیں۔ اُسے امّی نے کئی دن سے تین کا پہاڑا یاد کرنے کو دیا تھا۔ آج بھی امّی نے کہا کہ تین کا پہاڑا یاد کر لو، تب چھٹّی ملے گی۔ ہم تینوں پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اور خاقان نے تو جلدی جلدی کام ختم کر لیا، مگر ننھّی صاحِبہ کو پہاڑا یاد ہونا تھا نہ ہوا۔ ہم گھبرائے کہ اب اِس کے ساتھ ہم بھی مارے گئے۔ بہت کوشش کی مگر اُسے پہاڑا یاد نہ ہوا۔

آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ میں نے اور خاقان نے کاغذ کے ٹکڑے کاٹے اور اُن پر موٹے موٹے ہندسوں میں تین کا پہاڑا لکھ دیا۔ ابّا جان صوفے پر بیٹھے تھے۔ ہم دونوں چُپکے سے اُن کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ننھّی معصوم سی صورت بنائے ابّا جان کے سامنے کھڑی تھی۔

اب ننھّی نے پہاڑا سُنانا شروع کیا۔ ہم پہاڑے کا ایک ایک پرچہ ابّا جان کے پیچھے سے اُس کو دکھاتے گئے اور وہ سُناتی چلی گئی۔ جب تین اُٹھّے پر پہنچی تو اچانک پرچہ ہمارے ہاتھ سے چھُوٹا اور ابّا جان کی گود میں جا گرا۔ ہم گھبرا کر آگے بڑھے تو تمام پرچے ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور پنکھے کی ہوا نے تین کے پہاڑے کو سارے کمرے میں بکھیر دیا۔

اِس کے بعد ہم تینوں دیوار کی طرف مُنھ کیے کھڑے تھے اور سب گھر والے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

(خدیجہ عنبرین چنگیزی، کراچی)

ہم جو مانیٹر بنے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ باجی ہمیں حساب خوب سمجھا کر پڑھاتی تھیں۔ اِس لیے حساب میں ہم ساری کلاس میں تیز تھے اور حساب کے ماسٹر صاحِب نے ہمیں مانیٹر بنا دیا تھا۔ مانیٹر بننے سے ہم بہُت خوش تھے اور سارے گھر میں خوب شیخی بگھارتے تھے۔

ایک دن ہمارے ماموں کے بچّوں کی چُھٹّی تھی۔ ہم نے اُنھیں اپنے اِسکول میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ حساب کے پیریڈ میں اِسکول پہنچ جانا اور پھر دیکھنا کہ ہم مانیٹر بن کر لڑکوں پر کیسا رُعب جماتے ہیں۔ مگر اِسے ہماری بدقسمتی سمجھیں کہ اُس دن ہمارے سارے سوال غلط ہو گئے، جس پر ماسٹر صاحِب نے ہمیں مُرغا بنا دیا۔

مُقرّرہ وقت پر ماموں جان کے بچّے اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر ہماری مانیٹری دیکھنے آئے تو اُن کی ہنسی چھوٹ گئی اور ہم نے شرمندہ ہو کر سر ذرا اور نیچے کر لیا۔

اب بھی جب ہماری مانیٹری کا یہ قصّہ سُنایا جاتا ہے تو ہم شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور شیخی بگھارنے سے توبہ کرتے ہیں۔ (اِعجاز افضل، راولپنڈی)

(آپ بھی اِس طرح کے چٹ پٹے واقعات لکھیے۔ سب سے دل حسب واقعے پر 25 روپے کی کتابیں اِنعام میں دی جائیں گی)

آپ بھی لکھیے

Sharjeel Ahmed

ہمارا دیس، ہماری پہچان

راشدہ رسول، راجا جنگ

یہ واقعہ ہمارے ایک عزیز کے ساتھ پیش آیا۔ ہم آپ کو اُنہی کی زبانی سُناتے ہیں۔

پچھلے سال مجھے اپنے تایا ابّو کے پاس لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاز لندن ایئرپورٹ پر اُترا تو اُس وقت میرے کزن رضوان اور شروان مجھے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ مُصافحہ کیا۔ اِس کے بعد ہم لوگ گھر آ گئے، تایا جان نے مجھے گلے لگایا اور خوب پیار کیا۔ لندن میں قیام کے دوران میں مَیں بہت سے لوگوں سے ملا، بہت سی جگہوں پر گھوما پھرا، لیکن اپنا پاکستان ہر لمحہ یاد رہا۔

ایک دن میں اور میرے دونوں کزن لانگ ڈرائیونگ پر نکلے۔ ہم لوگ گھر سے کوئی پانچ چھ کلومیٹر دور گئے تو گاڑی نے چلنے سے اِنکار کر دیا۔ اُس میں کوئی خرابی ہو گئی تھی اور ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک ورک شاپ نزدیک تھی۔ ہم گاڑی کو ورک شاپ میں لے گئے، مگر اُن لوگوں نے کہا کہ گاڑی آپ کو کل ملے گی۔

ہم لِفٹ لینے کے لیے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور ہر آنے والی گاڑی کو رُکنے کا اِشارہ کرنے لگے۔ مگر کوئی بھی ہمارے اِشارے کا نوٹس نہ لیتا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد ایک سفید ٹیوٹا ہمارے اشارے پر رُک گئی۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ اُس میں ایک درمیانی عُمر کے صاحِب بیٹھے عیسیٰ خیلوی کا کیسٹ سُن رہے تھے۔ اُنہوں نے گاڑی سے باہر آ کر ہم سے ہاتھ ملایا، پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا، ہمارے گھر کا پتا معلوم کیا اور پھر گاڑی اِسٹارٹ کر دی۔

میں نے اُن صاحِب سے پوچھا "انکل، آپ ہمیں جانتے ہیں؟"

اُنہوں نے کہا "نہیں، بھئی۔ میں آپ لوگوں کو نہیں جانتا۔ لیکن جب میں نے آپ کو یہاں کھڑے دیکھا تو سوچا یہ میرے پاکستانی بھائی ہیں۔ مجھے اِن کی مدد کرنی چاہیے۔"

"انکل، آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم پاکستانی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ کی شلوار قمیص اور واسکٹ سے، جو پاکستانیوں کا قومی لباس ہے۔ اگر آپ نے جینز اور شرٹس پہنی ہوتیں تو میں آپ کو کسی اور ملک کا باشندہ سمجھ کر گزر جاتا۔"

اُس وقت ہمیں اپنی قومی پہچان پر بہت فخر محسوس ہوا۔ ہمیں چاہیے کہ دُنیا کے کسی بھی خطّے میں جائیں، اپنا قومی لباس پہنیں، کیوں کہ یہی ہماری شناخت ہے۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

اُستاد کی شان

سعدیہ فاروقی، مُغل پورہ لاہور

بہت دن پہلے کی بات ہے، ایک بہت بڑے عالِم مسجدِ نبویؐ کے صحن میں اپنے شاگردوں کو حدیث پڑھا رہے تھے۔ مسجدِ نبویؐ اُس مُقدّس مسجد کا نام ہے جو حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ شریف میں اُس وقت بنائی تھی جب آپؐ مکّے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تھے۔

جن عالِم کا ہم نے ذکر کیا، اُن کا نام حضرت اِمام مالِکؒ ہے۔ اُن کو خدا نے ایسا رُتبہ دیا تھا کہ دُور دُور کے مُلکوں سے

طالبِ علم اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حدیث شریف پڑھتے تھے۔ آپ کی لکھی ہوئی ایک کتاب "مؤطا اِمام مالک" ہے اور یہ آج بھی دین کا عِلم حاصل کرنے والے طالبِ علموں کو پڑھائی جاتی ہے۔

ہاں، تو ہم یہ بتا رہے تھے کہ حضرت امام مالک مسجدِ نبوی کے صحن میں بیٹھے اپنے شاگردوں کو حدیث شریف کا درس دے رہے تھے کہ ایک بچھّو آپ کے کُرتے کے اندر گھُس گیا اور اُس نے آپ کی کمر پر ڈنک مارا۔ بچھّو کے ڈنک مارنے سے اِمام صاحِب کو بہُت تکلیف ہوئی، لیکن حدیث شریف کے اِحترام کے خیال سے آپ نے اِس تکلیف کو برداشت کیا۔ البتّہ تکلیف کی وجہ سے آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا جسے آپ کے پاس بیٹھے ہوئے شاگردوں نے بھی محسوس کیا۔

اِسی تکلیف کی حالت میں آپ نے شاگردوں کو پورا سبَق پڑھایا اور جب سبق ختم ہو گیا تو ایک شاگرد سے فرمایا،

"میاں، ذرا ہمارا کُرتا تو اُٹھا کر دیکھو۔ ہماری کمر پر کیا چیز چڑھ گئی ہے۔"

شاگردوں نے کُرتا اُٹھایا تو دیکھا کہ ایک بچھّو ہے۔ اُس کو اُسی وقت مار دیا گیا۔ اِس کے بعد شاگردوں نے حضرت اِمام سے کہا کہ یا حضرت! آپ ایسی تکلیف میں سبق پڑھاتے رہے؟ اگر آپ اُسی وقت فرما دیتے جس وقت بچھّو آپ کی کمر پر چڑھا تھا تو ہم اُسے فوراً ہلاک کر دیتے۔"

اِمام مالک نے جواب دیا "میں اپنی تکلیف کی وجہ سے ایسا کرتا تو سبق بیچ میں روکنا پڑتا، اور ایسا کرنے سے تمہارا حرج ہوتا۔ اِس کے عِلاوہ اُس اِحترام میں بھی فرق آتا جو ایک سچّے مسلمان کے دل میں حدیث شریف کے لیے لازمی طور پر ہونا چاہیئے۔"

(دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)۔

خوش قِسمت

Sharjeel Ahmed

مائرہ شفیق، راولپنڈی

بہُت سے بچّے اپنے والِد کو ابّو کہہ کر پکارتے ہیں، لیکن میں اپنے والِد کو پاپا کہتی ہوں۔ میرے پاپا فوج میں کرنل ہیں اور بہُت بہادُر شخص ہیں۔ مجھے اُن پر فخر ہے۔ وہ نہ صرف بہُت بہادُر ہیں بلکہ بہُت خوش قِسمت بھی ہیں۔ اُن کی خوش قسمتی کا ایک واقِعہ اُنہی کی زبانی سُنیے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں لیفٹیننٹ تھا۔ ایک دفعہ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ ایک ایسے عِلاقے میں سفر کر رہا تھا جس کے دونوں طرف چٹیَل میدان تھے۔ شدید گرمیوں کا موسم تھا، اِس لیے دور دور تک کسی انسان کا نام نشان تک نہ تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے جیپ رُکوائی تاکہ اِدھر اُدھر کا جائزہ لے سکوں۔ اُس وقت میں نے لانگ بُوٹ پہن رکھے تھے۔

میں جیپ سے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میرے پیچھے پیچھے ڈرائیور آ رہا تھا کہ ایک دم وہ چونک اُٹھا اور چیخ مار کر کہا "اِسٹیچو (STATUE)" (فوج میں جب کوئی شخص کسی کو اِسٹیچو کہہ دے تو وہ بُت کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے)۔ چُناں چہ میں یہ سُنتے ہی بُت کی طرح بے حرکت کھڑا ہو گیا۔

ڈرائیور نے چیخ کر بتایا "سر، آپ کے پاؤں کے نیچے بارودی سُرنگ ہے۔"

میں نے فوراً اپنے پاؤں پر نگاہ ڈالی تو وہ ایک بارودی سُرنگ کے اُوپر تھا۔ پاؤں کی ایڑی اور اگلے حِصّے کے درمیان تھوڑا سا خلا ہوتا ہے۔ بارودی سُرنگ اُسی جگہ کے نیچے تھی۔ میں نے فوراً اپنا پاؤں اُٹھا لیا۔ اگر میں اُسے ذرا سا آگے پیچھے کرتا تو بارودی سُرنگ پھٹ جاتی اور میرے پرخچے اُڑ جاتے۔ اِس کے بعد مجھے پتا چلا کہ ہم ایک ایسی جگہ چلے گئے تھے جہاں جگہ جگہ بارودی سُرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ میری خوش قسمتی

تھی کہ میں نے ایک بارودی سُرنگ کے اُوپر پاؤں رکھ دیا اور پھر بھی زندہ بچ گیا۔ (تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

ہم نے شاعری کی

حِنا حُسین، لاہور

ہم تو فارغ ہیں
ہم تو کھیلیں گے

اِس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے مُنہ اُٹھا کر دیکھا تو ہُما اِمتحان کے کمرے سے یہ بول گُن گُناتی ہوئی نکل رہی تھی۔ میں اپنا پیپر کر کے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔

ہُما اور میں جُڑواں بہنیں ہیں اور ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ اِسکول میں بھی اِکٹھے رہتے ہیں اور گھر میں بھی۔ جو کام کرتے ہیں اِکٹھے کرتے ہیں۔ اِسکول سے اگر ایک بُخار کی وجہ سے چھُٹی کرے تو دوسرا ضرور کرتا ہے۔ اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہم میں سے صرف ایک کو بُخار ہو۔

خیر، میں بات کر رہی تھی کہ ہم اپنا آخری پرچہ دے کر ہال سے باہر نکلے تھے۔ میں نے ہُما سے پوچھا "ہما، تم یہ کس شاعر کا بول گنگنا رہی ہو؟" کہنے لگی "یہ کسی عظیم شاعر کا نہیں، ایک عظیم شاعرہ کا بول ہے، اور وہ ہے ہُما حُسین" ہُما نے سر فخر سے بلند کرتے ہوئے کہا۔ میں کِھل کِھلا کر ہنس پڑی اور ہم گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

گھر جا کر ہم نے سوچا کہ اِن فراغت کے دِنوں میں کچھ کیا جائے۔ "کیوں نہ ہم شاعری کریں؟" ہُما نے تجویز پیش کی۔ باجی قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ ہمارا مذاق اُڑانے لگیں تو ہم نے اپنا شعر سُناتے ہوئے کہا:

ہماری شاعری کی ہے ہر جگہ دُھوم
جو کہتا ہے ہماری شاعری پر پڑے دُھول
وہ ہے بڑا بے کار و بے فضُول
حالانکہ ہم ہیں بڑے معقول و مقبول

ہما کی واہ واسے کمرے کی چھت ہلنے لگی۔ لیکن باجی نے صلواتیں سُنانا شروع کر دیں "اے خدا! اِن لڑکیوں کو عقل سے نواز۔ تُو نے اِن کو دو دماغ عطا کیے ہیں مگر ایک بھی کام نہیں کرتا۔"

ہم نے رونی صورت بنالی اور اپنا شعر آپی کو سُنانے چل پڑے۔ آپی کہنے لگیں "حِنا، ہُما، تمہاری شاعری سُن کر اِقبالؒ کی روح تڑپ اُٹھے گی۔" ہُما فوراً بولی:

ہم ہیں شاعراتِ عظیم
ہماری شاعری سے مر جاتے ہیں جراثیم

آپی نے ہنس کر ٹال دیا تو اپنا یہ شعر امّی کی خدمت میں پیش کیا:

ہم نے اپنی شاعری سے قوم کا نام کیا بلند
ہماری شاعری سُن کر مستی میں آئیں ملنگ

امّی ایک کالج میں لیکچرار ہیں۔ وہ سر پیٹ کر رہ گئیں۔ ہم پریشان ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔

اگلے دن امّی کالج چلی گئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود اپنے کپڑے سیتے ہیں۔ چُناں چہ کپڑا نکالا گیا، جسے ہم نے ایک سِلی ہوئی قمیص کے اُوپر رکھا اور کاٹتے چلے گئے۔ باجی نے ہزار بار منع کیا، لیکن ہم باز نہ آئے۔ خیر، امّی کے آنے تک ہم نے قمیص سی لی۔ امّی نے دیکھی تو بولیں "مُفت کی کمائی ہے جو فضول کپڑا ضائع کیا؟"

ہُما نے مجھ سے کہا کہ کیوں نہ ہم اِس پر بھی ایک نظم لکھیں۔ چُناں چہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک اعلیٰ درجے کی نظم کہہ ڈالی۔ لیکن اُسے سُنتے ہی سب گھر والوں کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ آپ بھی سُنیے:

ہم نے سینا شروع کی قمیص
چھوٹی اِتنی تھی کہ بن گئی شمیص
بازُو تھے اُس کے بہت چھوٹے
لگتا تھا کہ بنے ہیں بیل بُوٹے

پھر ہم نے سِیا اُس کا کالر
پہن کر لگتے تھے ہم جوکر
اُس پر ہم نے لگائی ٹائی
جو کہ بنی وجہِ پٹائی
کچھ حال نہ تھا، ہم تھے بے حال
امّی نے کہا کہ کیا تھا یہ مُفت کا مال؟
یہ کام تھا جس سے ہم ہوئے جاتے تھے نِڈھال
غرض ہم پر تو آ گیا تھا زبردست زوال

آپ نے ہماری شاعری تو پڑھ لی۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ہم عظیم و برتر شاعر ہیں کہ نہیں؟ دیکھا؟ آپ سب کہَ رہے ہیں کہ واقعی ہم عظیم شاعر ہیں۔ ارے! شاعر نہیں، شاعرہ۔"

(چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں۔ حِنا حُسین اپنا پُورا پتا لکھ کر بھیجیں)۔

جادو کا تماشا

محمّد مدثّر ملک، وارِث روڈ لاہور

یہ پچھلی سردیوں کا واقعہ ہے۔ اُن دِنوں ہمارے رشتے کی ایک خالہ ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے جگنُو میاں بھی شرارتوں کے پلندے کے ساتھ تشریف لائے تھے۔

ایک دن ہم سب لحافوں میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ جگنُو میاں نے کہا کہ میں ایک جادوگر ہوں۔ جو میری بات کا یقین نہیں کرے گا، میں اُسے لوٹے میں بند کر دوں گا۔

یہ سُن کر میں کھڑا ہو گیا اور کہا "حضرت، ایسی ہی بات ہے تو مجھے لوٹے میں بند کر دیں۔"

اُنھوں نے کہا "چلو، ٹھیک ہے۔ پہلے میں اپنے جِن کو بُلا لوں، جس کی مدد سے تمھیں لوٹے میں بند کروں گا۔"

یہ کہَ کر وہ شیشے کے سامنے کھڑے ہو گئے، آستینیں اُوپر چڑھائیں، مُنہ پُھلایا، ناک سُکیڑی اور ہاتھ اُٹھا کر اُوپر نیچے گھُمانے پِھرانے لگے۔ اِس کے بعد ہم سے کہا "لو بھئی، میں تیّار ہوں۔"

اُنھوں نے پانی سے بھرا ہُوا لوٹا منگوایا اور کمرے کے بیچ میں رکھ دیا۔ پھر ایک چادر منگوائی اور کہا کہ اب میں کمرے سے باہر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد آؤں گا اور آنے سے پہلے آواز دُوں گا تو تم لوگ بجلی بُجھا دینا۔ یہ کہَ کر وہ باہر چلے گئے۔

کوئی چار مِنٹ بعد اُن کی آواز آئی تو بجلی بُجھا دی گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئے اور مُجھ سے کہا کہ لوٹے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان لوٹا تھا۔

اِس کے بعد اُنھوں نے میرے بھائی سے کہا کہ وہ ہم دونوں پر چادر ڈال دو۔ پھر مُجھ سے کہا کہ جب میں تمھارے مُنہ پر ہاتھ پھیروں تو تم بھی میرے مُنہ پر ہاتھ پھیرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد اُنھوں نے بجلی جلانے کو کہا اور ہم دونوں پر سے چادر ہٹا دی گئی۔ چادر ہٹتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سینہ پُھلا کر کہا "لو! بند کر دیا مجھے لوٹے میں؟"

لیکن سب لوگ ہنس رہے تھے۔ میں نے پوچھا "کیوں بھئی، کیا ہوا؟"

میرے بھائی نے کہا "پہلے شیشے میں مُنہ تو دیکھ لو۔"

میں نے جو شیشے میں مُنہ دیکھا تو سارا چہرہ سیاہ دکھائی دیا۔ میں نہایت شرمندہ ہُوا اور غُسل خانے کی طرف بھاگا۔ پھر مُنہ دھو کر کمرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ جب جگنُو میاں کمرے سے باہر گئے تھے تو اُنھوں نے توے کی کالک ہاتھوں پر مَل لی تھی۔ بجلی بند ہونے کی وجہ سے اُن کے سیاہ ہاتھ نظر نہ آئے۔ پھر اُنھوں نے چادر کے نیچے بیٹھ کر کالک سے بھرے ہوئے ہاتھ میرے مُنہ پر اور میں نے اپنے صاف ہاتھ اُن کے مُنہ پر مَل دیے۔ اِس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ آپ جانتے ہی ہیں۔

(پانچواں اِنعام: 30 روپے کی کتابیں۔)

پیار سے پیارا پاکستان

Sharjeel Ahmed

پیار سے پیارا پاکستان
آؤ بڑھائیں اس کی شان

اپنا پرچم اونچا اٹھائیں　　اپنے وطن کی شان دکھائیں
آزادی کے رنگ سجائیں　　مرنا سیکھیں، جینا سکھائیں

پیار بنے خود پیار کی شان
پیار سے پیارا پاکستان

رنگ اور خون کی بات بھلا دو　　آپس کے جھگڑوں کو مٹا دو
نفرت چھوڑو، پیار جگا دو　　قوم کو زندہ قوم بنا دو

آزادی کا رکھ لو مان
پیار سے پیارا پاکستان

چاروں صوبے جان وطن کی　　دیکھو بہاریں ان کے ملن کی
ڈالی ڈالی مہکے چمن کی　　رونق ہے یہ تن من دھن کی

ہم سب پیار کی ہیں پہچان
پیار سے پیارا پاکستان
آؤ بڑھائیں اس کی شان

فرحت شاہ جہان پوری

محمد ادریس قریشی

Sharjeel Ahmed

دادا جان کا حلوا

"ارے! یہ میرا حلوا کون کھا گیا؟" دادا جان کی آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔

جُمعے کا دن تھا، اور صبح کا وقت۔ امّی جان باورچی خانے میں ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ ابّا جان صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اُن کا مُلازِم بخشو دیوار کے پاس بیٹھا اُن کے جوتے پالش کر رہا تھا، اور تینوں بچّے فاروق، دانش اور شازیہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

دادا جان کی آواز سُن کر سب چونک اُٹھے۔ شازیہ نے کہا "یہ دادا جان کیا فرما رہے ہیں؟"

اُسی وقت دادا جان کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لمبی سی چھڑی بار بار زمین پر مار رہے تھے۔ یہ اُن کے سخت غصّے کی علامت تھی۔ پھر اُنھوں نے بلند آواز میں کہا "سب لوگ فوراً میرے سامنے حاضر ہو جائیں۔ تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔"

فاروق، دانش اور شازیہ جلدی سے دادا جان کی طرف بڑھے۔ ابّا جان نے اخبار صوفے پر پھینکا، اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امّی جان نے توے پر سے پراٹھا اُتارا، اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے تیزی سے باورچی خانے سے باہر نکلیں۔ بخشو نے جوتے وہیں چھوڑے، اور برآمدے کی طرف لپکا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ داداجان کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی دیر کرتا۔

فاروق نے ڈرتے ڈرتے کہا "دادا جان، کیا ہوا؟ آپ کو غُصّہ کیوں آ رہا ہے؟"

دادا جان نے اُسے خوف ناک نظروں سے دیکھا، اور بولے "غصّے میں نہ آؤں تو کیا کروں؟ تم لوگوں نے چوری کی ہے میرے کمرے میں۔"

ابّا جان نے حیران ہو کر کہا "چوری؟ کس چیز کی؟"

دادا جان نے چھڑی زور سے زمین پر ماری، اور بولے "آؤ، میرے ساتھ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اُن کے پیچھے وہ

سب بھی اندر گھس گئے۔ دادا جان نے چھڑی سے میز کی طرف اشارہ کیا، جس پر ایک خالی پلیٹ رکھی تھی۔ انہوں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے میں نے حلوا پکا کر پلیٹ میں ڈالا، اور اس میز پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ دھونے باتھ روم میں گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو دیکھا کہ پلیٹ تو ہے لیکن حلوا غائب ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میرا حلوا کس نے کھایا ہے؟"

یہ سُن کر سب ایک دوسرے کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگے۔ دادا جان نے گرج دار آواز میں کہا "اب اِدھر اُدھر کیا دیکھتے ہو؟ میرے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ حلوا تم میں سے ہی کسی نے اندر آ کر کھایا ہے۔ یہ جس کی بھی شرارت ہے، فوراً مجھے بتا دے۔"

امّی جان نے گھبرا کر کہا "کم از کم آپ کا حلوا میں نے تو نہیں کھایا۔"

"اور نہ میں نے" ابّا جان بول اُٹھے۔

دادا جان نے کہا "جس نے بھی میرا حلوا کھایا ہے، میں اُس کا کھوج لگا کر رہوں گا۔ ہاں، فاروق، تم بتاؤ۔ حلوا کس نے کھایا ہے؟"

فاروق نے کانپتے ہوئے کہا "دادا جان، مم..... میں نہیں جانتا..... کہ آ..... آپ کا حلوا کس نے کھایا ہے۔"

اب دادا جان دانش کی طرف مُڑے، اور اُسے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "ہُوں! تو دانش میاں کہیں یہ تمہارا تو کام نہیں؟"

دانش نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا، اور بولا "نہیں، دادا جان۔ قسم سے، میں نے آپ کا حلوا بالکل نہیں کھایا۔"

"اچھا تو شازیہ، یہ شرارت تمہاری ہے" دادا جان شازیہ کی طرف گھوم گئے۔ شازیہ نے گڑبڑا کر کہا "نن..... نہیں، دادا جان۔ میں ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ اور حلوا تو مجھے ویسے ہی پسند نہیں ہے۔"

"اچھا، تو پھر یقیناً بخشو کھا گیا ہے۔ کیوں بخشو؟" دادا جان نے غصّے سے چھڑی لہرائی۔

بخشو بوکھلا کر بولا "قسم لے لیجیے۔ میں نے آپ کے حلوے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"تو پھر گیا کہاں؟" دادا جان چلّائے۔

امّی جان جلدی سے بولیں "میں آپ کو اور پکا دیتی ہُوں۔"

دادا جان نے بھنّا کر کہا "نہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اپنے لیے حلوا خود بناتا ہوں۔ تمہارا بنایا ہوا حلوا مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ جاؤ، چلے جاؤ۔ میرا حلوا آسمان سے اُتری ہوئی کوئی بلا کھا گئی ہو گی۔ آج میں ناشتا نہیں کروں گا۔ بھوکا رہوں گا۔ جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب اُن کے کمرے سے باہر آ گئے۔ شازیہ نے کہا "آخر دادا جان کا حلوا گیا کہاں؟"

فاروق بولا "کہیں وہ حلوا کھا کر بھول نہ گئے ہوں۔"

دانش نے کہا "نہیں۔ دادا جان اِتنے بُھلکڑ نہیں ہو سکتے۔"

امّی جان بولیں "تمہارے دادا بڑے ضِدّی ہیں۔ دو مہینے سے اُن پر نہ جانے کہاں سے حلوا کھانے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ صبح، دوپہر، شام حلوے کے سِوا کچھ نہیں کھاتے" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔

دادا جان کی اِس عادت سے سب ہی تنگ تھے۔ دو مہینے پہلے وہ گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن اب اُنہوں نے روٹی، سالن، چاول، انڈا، دودھ، دہی سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ بس انہیں حلوے ہی سے عشق ہو گیا تھا، حال آں کہ اُن کے سارے دانت سلامت تھے۔ اُنہوں نے حلوا پکانے کا سامان اپنے کمرے میں جمع کر رکھا تھا۔ اُن کے کمرے میں بجلی کا ایک ہیٹر تھا۔ وہ اُس پر تینوں وقت اپنے لیے حلوا پکاتے تھے، اور خود ہی کھا جاتے تھے۔ وہ چُوں کہ ہر وقت فارغ رہتے تھے، اِس لیے یا تو بیٹھک کا گلی کی طرف والا دروازہ کھول کر بیٹھ جاتے، اور اُن کے دوست اُن کے پاس آ

بیٹھتے. یا پھر باورچی خانے سے برتن لے کر حلوے کی تیاری میں مشغول ہو جاتے. اور حلوا کھا کر برتن باورچی خانے میں رکھ آتے۔

دادا جان نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دانش باورچی خانے میں آیا. اور بولا "امّی جان، آپ مجھے ایک پرانا. آملیٹ اور چائے دے دیں۔ میں دادا جان کو ناشتا کراؤں گا۔"

امّی جان نے کہا "تمہیں پتا تو ہے کہ وہ حلوے کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔"

"لیکن امّی. وہ بھوکے ہیں۔ آپ دیں تو سہی" اُس نے کہا۔

امّی جان نے اُس کے مجبور کرنے پر ایک پرانا. آملیٹ اور چائے ٹرے میں رکھ کر اُسے دے دی۔ وہ ٹرے اُٹھا کر دادا جان کے کمرے کے دروازے پر آیا اور بولا "دادا جان. دروازہ کھولیے۔"

اندر سے دادا جان کی آواز آئی "کیا بات ہے؟"

دانش نے کہا "پلیز. دروازہ تو کھولیے. اچھے دادا جان۔"

دادا جان نے دروازہ کھول دیا۔ دانش جلدی سے اندر داخل ہوا. اور ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔

دادا جان نے کہا "یہ ناشتا تم کس کے لیے لائے ہو؟"

"آپ کے لیے. دادا جان" دانش بولا۔

"اسے اُٹھا کر لے جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں صرف اور صرف حلوا کھاتا ہوں. اور آج میرا حلوا بھی کوئی کھا گیا" اُنہوں نے آنکھیں نکالیں۔

دانش نے بڑی معصومیت سے کہا "پیارے دادا جان، آپ اِس وقت تو ناشتا کر لیجیے۔ دوپہر کے وقت حلوا کھا لیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

دادا جان بولے "تو پھر یہ ناشتا یہیں پڑا رہے گا۔ میں اسے ہرگز نہیں کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے دروازہ بند کر لیا. اور اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ اُنہیں سخت بھوک لگی تھی.

لیکن ضد کی وجہ سے ناشتا نہیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتے رہے، پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور نہ جانے کیا بڑبڑاتے رہے۔ مُٹھیاں بھینچتے رہے۔ پھر اُٹھے، اور چھڑی اُٹھا کر کمرے میں اِدھر اُدھر چکّر لگانے لگے۔ اُنہوں نے دانت بھینچ رکھے تھے اور بار بار غصّے سے اپنی چھڑی زمین پر مار رہے تھے۔ کمرے کے دو تین چکّر کاٹ کر وہ پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گئے۔ ناشتے کی ٹرے میں چائے دانی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ پراٹھے اور آملیٹ کی خوشبو بھوک چمکا رہی تھی۔ وہ چند لمحے ٹرے کو دیکھتے رہے، پھر دروازے کی طرف دیکھا جو اندر سے بند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ناشتے کی ٹرے کی طرف بڑھے اور جلدی جلدی ناشتا کرنے لگے۔

باہر دانش، دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے اُنہیں ناشتا کرتے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سب کو خبر کر دی کہ دادا جان ناشتا کر رہے ہیں۔ فاروق، شازیہ، امّی جان، ابّو جان اور بخشو باری باری دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دادا جان کو ناشتا کرتے دیکھ رہے تھے، اور بہت خوش ہو رہے تھے۔ پھر وہ سب بھی ناشتا کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دادا جان نے کمرے کا دروازہ کھولا، اور بولے "آج تو میں نے ناشتا کر لیا ہے۔ یہ برتن اُٹھالو۔ آیندہ میں جب حلوا پکاؤں گا تو دروازہ اندر سے بند کر لوں گا۔"

شازیہ فوراً گئی اور ٹرے اُٹھا لائی۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

جب دوپہر کا وقت ہوا تو دادا جان پھر بڑے زور و شور سے حلوا بنانے لگے۔ حلوا بنا کر اُنہوں نے پلیٹ میں ڈالا، اور میز پر رکھ دیا۔ اب اُنہوں نے چمچے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو اُنہیں چمچہ کہیں نظر نہ آیا۔ اُنہوں نے دروازہ کھولا، اور باورچی خانے میں آکر چمچہ ڈھونڈنے لگے۔ امّی جان نے کہا "کیا آپ چمچ تلاش کر رہے ہیں؟ ٹھہریں، میں دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے ایک چمچہ اُنہیں دے دیا۔

جب دادا جان واپس اپنے کمرے میں پہنچے تو اُن کا خون کھول اُٹھا، اور آنکھیں غصّے سے سُرخ ہو گئیں۔ میز پر خالی پلیٹ پڑی تھی۔ حلوا غائب تھا!

اب تو اُنہوں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھالیا۔ وہ کسی کی کوئی بات سُننے کو تیّار نہ تھے۔ سب سے زیادہ شک اُنہیں بخشو پر تھا، اور وہ اُس پر بُری طرح گرج برس رہے تھے۔ بے چارہ بخشو قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گُناہی کا یقین دلا رہا تھا۔ ابّا جان نے کہا "حیرت تو اِس بات پر ہے کہ کوئی اِتنی جلدی حلوا کھا کیسے جاتا ہے؟"

دادا جان نے کہا "میں چور کی چالاکی سمجھ گیا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، حلوا کسی دوسرے برتن میں ڈال لیتا ہے، اور فوراً رفوچکّر ہو جاتا ہے۔"

اب تو گھر کے سب لوگ ہی حیران پریشان تھے۔ حلوا کہاں غائب ہو جاتا ہے؟ یہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دوپہر کا کھانا تیّار ہو گیا تو دانش نے دادا جان کا کھانا ٹرے میں رکھا، اور اُن کی میز پر رکھ دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے، اور نہ جانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔

دانش نے کہا "دادا جان، یہ کھانا پڑا ہے۔"

اُنہوں نے آنکھیں کھولیں، اور چیخ کر بولے "لے جاؤ اِسے۔ تم نے کیا مذاق بنا رکھا ہے؟ تم لوگ چور ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

دانش نے کھانا وہیں چھوڑا، اور باہر نکل آیا۔ دادا جان کا صدمے کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھے چور کو کوس رہے تھے، اور دانت کچکچا رہے تھے۔ لیکن بھوک کے آگے اُن کی ایک نہ چلی، اور اُن کی نظریں کھانے کی ٹرے کی طرف اُٹھ گئیں۔ گرم گرم روٹیاں اور بُھنے ہوئے گوشت کی خوش بو نے اُنہیں بے چین کر دیا۔ وہ میز کی طرف بڑھے اور جلدی جلدی کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد باہر برآمدے میں آئے، اور بولے "میں نے کھانا کھا لیا ہے۔ بُڑھاپے کی وجہ سے مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ لیکن شام کو میں حلوا پکاؤں گا تو ایک لمحے کو بھی اُسے نظروں سے دُور نہیں ہونے

دوں گا۔ دیکھوں گا اُسے کون اُٹھاتا ہے۔"

شام ہُوئی تو دادا جان پھر حلوا پکانے لگے۔ حلوا پکا کر اُنھوں نے پلیٹ میں ڈالا اور باتھ روم میں ہاتھ دھونے گئے تو پلیٹ بھی ساتھ ہی لے گئے اور پھر کمرے میں آ کر حلوا کھانے لگے۔ اپنی کام یابی اور چور کی ناکامی پر وہ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ حلوے کی پلیٹ خالی کر کے اُنھوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

رات کے کھانے کے بعد تینوں بچّے اپنے اپنے کمروں میں جا کر پڑھنے لگے۔ فاروق میٹرک کا طالبِ علم تھا، دانش چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا، اور شازیہ آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی۔

اُسی وقت ایک دُبلی پتلی عورت اُن کے گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خالی پلیٹ تھی۔ اُس نے امّی جان سے کہا "بہن، یہ لو اپنی پلیٹ۔ حلوے کے لیے بہت بہت شکریہ۔"

امّی جان نے کہا "ارے! میں نے کب آپ کے گھر حلوا بھیجا تھا؟"

عورت نے کہا "کیا یہ پلیٹ آپ کی نہیں؟"

امّی جان نے پلیٹ لے لی، اور بولیں "پلیٹ تو واقعی ہماری ہے، لیکن حلوا آپ کے گھر کون لے کر گیا تھا۔"

حلوے کا نام سُن کر دادا جان کمرے کے دروازے کے پاس آئے، اور کان لگا کر باہر کی باتیں سُننے لگے۔ وہ عورت کہہ رہی تھی "بہن، صبح آپ کا لڑکا دانش ہمارے ہاں حلوا دے گیا تھا، اور آپ کہہ رہی ہیں کہ حلوا آپ نے نہیں بھیجا۔"

اُسی وقت ایک اور موٹی سی عورت اندر آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں بھی ایک خالی پلیٹ تھی۔ اُس نے کہا "بہن، یہ حلوا کس خوشی میں بھیجا تھا آپ نے؟"

امّی جان نے حیران ہو کر کہا "میں نے تو آپ کے گھر حلوا نہیں بھیجا۔"

موٹی عورت نے ناک پر اُنگلی رکھ کر کہا "اے لو! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کا لڑکا دانش آج دوپہر ہی تو ہمارے گھر دے کر گیا تھا۔ کیا یہ پلیٹ آپ کی نہیں ہے؟"

امّی جان نے پلیٹ دیکھ کر کہا "پلیٹ تو ہماری ہی ہے۔"

اُسی وقت دادا جان اپنے کمرے سے باہر نکل آئے، اور بلند آواز سے کہنے لگے "اب سارا چکّر میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ دانش نے ہی میرا حلوا غائب کیا، اور پڑوسیوں کے گھر دے آیا۔ خیر، اُس سے تو میں پُوچھ لُوں گا۔"

دادا جان کو غصّے میں دیکھ کر دونوں عورتیں چلتی بنیں۔

اب دادا جان دانش کے کمرے کی طرف بڑھے۔ امّی جان اور ابّا جان بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ فاروق اور شازیہ شور سُن کر اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اُن کا ملازم بخشو چھُٹی کر کے جا چکا تھا۔ وہ سب دانش کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ اُس کی کتابیں میز پر پڑی تھیں۔ ابّا جان نے دادا جان سے کہا "آپ اس سے صبح پوچھ لیجیے گا۔ اب یہ سو رہا ہے۔"

فاروق، شازیہ اور اُن کی امّی جان نے بھی تائید میں سر ہلا دیے۔ دادا جان نے نہ جانے کس طرح اپنا غصّہ ضبط کیا، اور بولے "خیر، اِسے سونے دو۔ صبح میں اِس بدتمیز لڑکے کی اچھی طرح خبر لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ابّا جان نے کہا "دانش کے دادا پتا نہیں اُسے کیا سزا دیں گے۔"

امّی جان نے کہا "دانش سے ایسے کام کی توقّع نہیں تھی۔"

صبح فجر کے وقت دادا جان کی آنکھ کھُل گئی۔ اذان کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ وہ صبح کی نماز مسجد میں پڑھتے تھے۔ اُنھوں نے ٹوپی سر پر رکھی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ جب وہ دانش کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو اُس کی آواز سُن کر رُک گئے۔ اُنھوں نے ادھ کھُلے دروازے

سے اندر جھانکا۔ دانش جانماز پر بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہا تھا:

"اچھے اللہ میاں! مجھے معاف کر دو۔ میں نے اپنے پیارے دادا جان کو خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ میں اُن کا حلوا پڑوسیوں کے گھر دے آیا تھا۔ اللہ میاں! میں نے چوری ہرگز نہیں کی۔ میں چاہتا ہوں کہ دادا جان حلوا کھانا چھوڑ دیں۔ اچھے اللہ میاں! دادا جان کی حلوے کی عادت چھُڑا دو۔ زیادہ میٹھا کھانے سے اِنسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے دادا جان کو سلامت رکھ، اور اُنھیں ہر بیماری سے بچا۔ " یہ دُعا کر کے وہ جانماز کو تہ کرنے لگا۔

اُس وقت دادا جان کی عجیب حالت تھی۔ اُنھیں پہلی بار یہ اِحساس ہوا تھا کہ اُن کا پوتا اُن سے کتنی محبّت کرتا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ آہستہ آہستہ مسجد کی طرف چل دیے۔

صبح ناشتے کی میز پر ابّا جان نے دانش سے کہا "ہاں بھئی، دانش میاں۔ دادا جان کو تمہاری حرکت کا پتا چل گیا ہے۔ اب [illegible] نہ جانے کیا سزا دیں گے۔ "

امّی جان نے کہا "وہ شاید نماز کے بعد پھر سو گئے ہیں۔ آج اُن کے کمرے سے حلوے کی خوش بُو بھی نہیں آ رہی۔ "

اُسی وقت دادا جان کمرے سے نکلتے دکھائی دیے۔ وہ سیدھے ناشتے کی میز پر آئے، اور ایک کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ سب مُنتظِر تھے کہ وہ دانش کو سزا دیں گے۔

دادا جان نے سب پر ایک نظر ڈالی، اور بولے "آج سے میں تمہارے ساتھ ہی کھانا کھایا کروں گا۔ حلوا کھاؤں گا ضرور، لیکن کبھی کبھار۔ کھانے میں کسی بھی چیز کی زیادتی بُری ہوتی ہے۔ اِس بات کا اِحساس میرے پیارے بیٹے دانش نے مجھے دلا دیا ہے۔ " یہ کہہ کر اُنھوں نے دانش کو پیار کیا، اور ناشتا کرنے لگے۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

مہتاب اسلم

خواہش کا وبال

نیشنل پارک میں پہنچتے ہی وقار نے اپنی سائیکل درخت کے نیچے کھڑی کی اور خود قریب پڑی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ پندرہ سال کا ایک جذباتی سا لڑکا تھا اور ہر وقت خیالی پُلاؤ پکانا اُس کی عادت تھی۔ ہر روز اِسکول سے واپسی پر اِس پارک میں آکر کسی بنچ پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں سوچتا رہتا۔ وہ خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو ایک طاقت وَر انسان کے رُوپ میں دیکھتا جو کم زور اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اُسے کوئی ایسی غیبی طاقت مل جائے جس سے وہ حاجت مند لوگوں کے کام آئے اور اُن کی مُشکلیں دُور کرے۔ وہ صرف سوچتا ہی تھا۔ حقیقت میں اُس نے کبھی کسی کی مدد نہیں کی تھی۔ وہ تصوُّر میں ہی کئی لوگوں کے مسئلے حل کر دیتا تھا۔ اگر کسی غریب شخص کو دیکھتا تو خیال ہی خیال میں اُس کی جیب میں نوٹوں کے بنڈل رکھ دیتا۔ اگر کسی بیمار کو دیکھتا تو تصوُّر ہی میں دُنیا کا سب سے بڑا ڈاکٹر بن کر اُس کا مُفت علاج کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مریض تن دُرست ہو کر پہلوان بن جاتا۔

بنچ پر بیٹھے بیٹھے اُس پر غنُودگی طاری ہو گئی۔ ابھی اُس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک اُسے کسی کی آواز سُنائی دی "میری مدد کرو! مجھے اِس قید سے نجات دلاؤ! خدا کے لیے میری مدد کرو!"

اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور آواز کی سَمت کا اندازہ کیا۔ آواز درخت کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ وہ گھوم کر درخت کے پیچھے پہنچ گیا۔ اُسے شیشے کی ایک بوتل نظر آئی جو گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے لپک کر بوتل اُٹھالی۔ بوتل میں دُھواں بھرا ہُوا تھا اور وہ پُراَسرار آواز اُس کے اندر ہی سے آ رہی تھی۔

"اے لڑکے! میری مدد کرو۔ مجھے اِس بوتل میں سے نکالو۔ میں تمھارا بہُت احسان مند ہوں گا" بوتل کے اندر سے دوبارہ آواز آئی۔

وقار نے بے سوچے سمجھے بوتل کے مُنہ پر لگے ڈھکّن کو کھول دیا۔ بوتل کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اُچھل کر زمین پر گر پڑی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بوتل میں سے نکلنے والے دُھوئیں نے ایک بہُت بڑے جِن کی صورت اِختیار کر لی۔

"ہا، ہا، ہا! مہربان لڑکے! تم نے اِس بوتل کی قید سے نکال کر مجھ پر بہُت بڑا اِحسان کیا ہے۔ مانگو! کیا مانگتے ہو؟ میں تمھاری کوئی بھی خواہش پلک جھپکتے پوری کر سکتا ہُوں" جِن نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

وقار خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اُس کی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ اس جن سے کوئی خفیہ طاقت حاصل کر سکتا تھا۔ اُس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا:

"سنو، جن! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں غائب ہو جاؤں اور — " اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا، جن کی آواز کے ساتھ اُسے ایک زور دار جھٹکا لگا اور جب اُس کے ارد گرد پھیلنے والا سفید دھواں چھٹا تو جن اُس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

"عجیب احسان فراموش تھا۔ میری پوری بات تو سنی نہیں اور کہتا تھا کہ میں تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ ہونہہ!" وقار نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

اُس نے اپنی سائیکل اُٹھائی اور اُس پر سوار ہو کر پارک سے باہر نکل آیا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُس سے سائیکل ٹھیک طرح سے کیوں نہیں چل رہی۔ اُسے اپنا جسم بڑا ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ پھر جوں ہی وہ سڑک پر آیا، اُس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سامنے سے ایک خوانچہ فروش آ رہا تھا۔ اُس کی نظر سائیکل پر پڑی تو اُس نے چیخ کر کہا:

"ارے! سائیکل خود بخود چل رہی ہے! دیکھو، لوگو! دیکھو!" وہ چیخ چیخ کر ارد گرد کے لوگوں کو متوجہ کرنے لگا۔

اس دوران میں سائیکل سڑک کے درمیان پہنچ چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر چوک میں کھڑے پولیس کانسٹیبل کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، گال پھول گئے اور منہ میں دبی ہوئی وسل زور زور سے بجنے لگی۔ وہ ایک سائیکل کو خود بخود چلتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور اس گھبراہٹ میں دائیں بائیں ہاتھ ہلانے لگا تھا۔ اُس کے غلط اشاروں پر گاڑیاں آگے بڑھیں تو کئی دھماکے ہوئے اور کئی گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ گاڑیوں کے ڈرائیور بھی سائیکل کو خود بخود چلتا دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے۔ لمحہ بھر میں ساری ٹریفک رُک گئی۔ اب وقار کو صحیح

صورتِ حال کا اِحساس ہوا۔ وہ غائب ہو گیا تھا اور لوگ سائیکل کو بغیر سوار کے چلتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔

اُس نے فوراً سائیکل روکی اور نیچے اُتر گیا۔ اِس دوران میں کئی پولیس والے سائیکل کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ وقار نے سائیکل چھوڑی تو وہ دھڑام سے سڑک پر گر پڑی۔ پولیس والے اور دوسرے لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

وقار سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں! سائیکل کے کیریئر پر اُس کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں جن میں اُس کے گھر کا پتا موجود تھا۔ پولیس والے یقیناً اُس کے گھر پہنچ جائیں گے اور پھر اُس کے والدین کو پریشان کریں گے۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اُسے کوئی ایسی خُفیہ طاقت حاصل ہو جائے جس کی مدد سے وہ جب چاہے غائب ہو جائے اور جب چاہے نمودار ہو جائے۔ لیکن یہاں تو مُعاملہ اُلٹا ہو گیا تھا۔ جِن اُسے غائب کر کے چلا گیا تھا، اور اُسے ظاہر ہونے کا منتر نہیں آتا تھا۔

وہ پریشانی کے عالم میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

وہ اِس ہجوم سے نکلنا چاہتا تھا کہ اچانک اُسے اپنے پیچھے کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک کتّا بڑی تیزی سے اُس کی طرف لپک رہا تھا اور اُس کے ساتھ اُس کا مالک بھی کھنچا چلا آ رہا تھا۔ اُس نے اُس کے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر اپنے ہاتھ میں لپیٹ رکھی تھی۔ کتّے کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وقار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ اِس حالت میں بھی کتّے کو نظر آ رہا تھا۔

اِس سے پہلے کہ کُتّا وقار تک پہنچتا، اُس نے پوری رفتار سے فٹ پاتھ پر دوڑ لگا دی۔ اُسے اپنے پاؤں بھاری بھاری لگ رہے تھے اور اُس سے بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر چھابڑیوں اور خوانچے والے قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور اُس کے لیے اُن کے درمیان بھاگنا مشکل ہو رہا تھا۔ کتّا مُسلسل بھونکتا ہُوا اُس کے تعاقب میں تھا، اور اُس کے ساتھ اُس کا مالک بھی ہانپتا کانپتا بھاگ رہا تھا۔

وقار بھاگتا بھاگتا ایک پھل والے کے قریب پہنچ گیا۔ پھل والا ایک گاہک کو پھل تول کر دے رہا تھا۔ وہ اُس کے ترازو والے ہاتھ سے ٹکرایا تو ترازو اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ وہ ترازو اُٹھانے کے لیے نیچے جُھکا تو پیچھے سے آنے والے کتّے نے اُس کے اُوپر چھلانگ لگا دی، اور اس کے ساتھ ہی کتّے کا مالک پھلوں کے ٹوکرے میں ڈھیر ہو گیا۔ کتّے کی زنجیر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ زنجیر چھوٹتے ہی کتّے نے پوری رفتار سے دوڑ لگا دی۔ وقار نے مُڑ کر دیکھا تو اُس کی ریڑھ کی ہڈّی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اب کتّا کسی وقت بھی اُسے دبوچ سکتا تھا!

وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا کہ اُس کے سامنے ایک دیوار آ گئی۔ وہ فوراً دیوار پھلانگ کر دوسری طرف کُود گیا۔ اب اُسے کچھ اِطمینان ہُوا کہ کم از کم کتّے سے تو جان چھوٹی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اچانک اُسے اپنا چہرہ گیلا گیلا سا محسوس ہُوا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھو لیں۔ دیوار پر اِشتہار لکھنے والا اُس کے چہرے پر چُونے میں بھیگا ہُوا برش چلا رہا تھا۔

وقار کو اُس پر سخت غُصّہ آیا۔ وہ اُسے بُرا بھلا کہنے والا ہی تھا کہ عین اُسی لمحے دیوار کے اُوپر سے کتّے نے اِشتہار لکھنے والے پر چھلانگ لگا دی۔ چُونے کا ڈبّا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سارا چُونا وقار کے اُوپر گر پڑا۔ چُونے والا کتّے سے ڈر کر دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا۔ وقار نے دیر نہیں لگائی اور ایک دم دوڑ لگا دی۔ کتّا اُس کے پیچھے تھا۔

وہ بھاگتے بھاگتے پھر سڑک پر نکل آیا۔ کتّا بھی بھونکتا ہوا پوری رفتار سے اُس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اچانک وقار کو ایک ٹیکسی نظر آئی۔ وہ ٹیکسی کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور دروازے کو خود بہ خود کُھلتے اور بند ہوتے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"چلو، گاڑی چلاؤ۔ جلدی کرو۔ کتّا قریب آ رہا ہے" وقار نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی والا بوکھلا کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ وقار نے گاڑی سے باہر دیکھا۔ کتّا گاڑی کے پاس پہنچنے ہی والا تھا۔

"چلو، جلدی کرو!" اُس نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

ڈرائیور نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اُسے کوئی نظر نہ آیا تو چیختا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ وہ وقار کو بھوت سمجھ کر ڈر گیا تھا۔

کتّا اب گاڑی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ وقار نے جلدی سے دونوں طرف کے شیشے چڑھا دیے اور اچھل کر ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کتّا گاڑی کے بونٹ پر چڑھ گیا اور شیشے پر پنجے مارنے لگا۔

اِس اَفراتفری میں وقار کا پاؤں گاڑی کے ایکسی لیٹر پر پڑ گیا اور اُس کے بائیں ہاتھ کا جھٹکا لگنے سے گاڑی گیئر میں پڑ گئی۔ گاڑی کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ ایک دم فرّاٹے بھرنے لگی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ کتّا اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔

اچانک اُس کے کانوں میں ہارن کی زور دار آواز آئی پاں..... پاں۔ اُس نے آگے دیکھا تو اُس کی رُوح فنا ہو گئی۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اِسٹیرنگ گھمایا تو ٹیکسی ٹرک کے قریب سے گزرتی ہوئی ایک پُل پر چڑھ گئی۔ یہ ایک شکستہ اور پُرانا پُل تھا اور اُس کے نیچے سینکڑوں فٹ گہرا پانی۔ وقار کے پسینے چھوٹ گئے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عین اُسی وقت ٹیکسی ایک دھماکے سے پُل کے جنگلے سے ٹکرائی اور پھر اُسے توڑتی ہوئی نیچے لٹک گئی۔ اُس کا مڈگارڈ جنگلے میں پھنس گیا تھا اور وہ پُل کے نیچے ہوا میں جھول رہی تھی۔ کسی وقت بھی نیچے دریا میں گر سکتی تھی۔

وقار سوچنے لگا کہ اگر اُسے ایک موقع اور مِل جائے تو وہ زندگی کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھے گا اور کبھی کسی غیبی طاقت کی آرزو نہیں کرے گا۔ خدا نے اُسے جس قدر ہمّت اور توفیق دی ہے، اُسی کے مُطابق دوسروں کے کام آئے گا اور کبھی خیالی پُلاؤ نہیں پکائے گا۔

"اے اللہ! مجھے مُعاف کر دے اور مجھے ایک موقع اور دے" اُس کے دِل کی گہرائیوں سے دُعا نکلی۔

اُسی لمحے اُس کے کانوں میں کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اُس نے اُوپر پُل کی طرف دیکھا۔ کتّا ٹوٹے ہوئے جنگلے کے قریب کھڑا غُرّا رہا تھا۔ اور پھر اُس نے ایک دم فضا میں جُھولتی ہوئی ٹیکسی پر چھلانگ لگا دی۔ ٹیکسی کو ایک زور کا دھکّا لگا اور وہ جنگلے سے نکل کر تیزی سے نیچے دریا میں گرنے لگی۔

"آہ.....!" وقار ایک خوف ناک چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں مَل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ پارک میں بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی سائیکل درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک بوڑھا بیٹھا اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وقار کا سر چکرا رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ بوڑھے کے پاؤں کے قریب بیٹھا اُس کا پالتو کتّا بھی عجیب نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بھئی، برخوردار، کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے تھے کیا؟" بوڑھے نے وقار کو مُخاطب کر کے کہا۔

"بڑے میاں، کیا میں آپ کو نظر آ رہا ہوں؟" وقار نے احمقوں کی طرح اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہیں! کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں اندھا ہوں؟ واہ! بھئی۔ عجیب بدتمیز قسم کے لڑکے واقع ہوئے ہو" بوڑھے نے آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔

وقار آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اپنی سائیکل کی طرف بڑھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُسے خواب میں کیا ہُوا اپنا عہد یاد تھا۔

انار

Sharjeel Ahmed

انار مزے دار پھل ہی نہیں، ایک مُفید دوا بھی ہے۔ اِس سے بُہت سی بیماریوں کا عِلاج کیا جاتا ہے۔ اِس کا درخت دس فُٹ سے پندرہ فٹ تک اُونچا، تنا پتلا اور چھال اکثر بھوری ہوتی ہے۔ پھول گہرے سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ چھلکا باہر سے سُرخ یا زرد اور اُس کے اندر سُرخ یا سفید رنگ کے دانے موتیوں کی طرح گُتھے ہوئے ہوتے ہیں۔

انار میں وٹامن سی اور ڈی کے عِلاوہ کچھ معدنی اَجزا بھی پائے جاتے ہیں۔ طبیب اِس کے رس، چھلکوں، چھال، پتّوں اور جڑ سے بُہت سی دوائیں بناتے ہیں۔ یہ پھل دل، دماغ، مِعدے، انتڑیوں اور مثانے کی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ پاگل پن اور خفقان جیسی بیماریوں میں بھی اِس کا اِستعمال بڑا فائدہ مند ہے۔ مِعدے کی اکثر بیماریوں مثلاً بھوک نہ لگنے، پیٹ کے کیڑوں، متلی اور بدہضمی کا بہترین علاج ہے۔

انار کا اصل وطن کون سا ہے؟ اِس کے مُتعلّق یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ یہ پھل عرب میں پایا جاتا تھا۔ وہیں سے اِس کے پودے دوسرے ملکوں میں پہنچے۔ اب پاکستان، بھارت، افغانستان، اِیران، عرب ممالِک، وسطی ایشیا اور جنوبی یورپ میں اُگایا جاتا ہے۔

یہ پھل امیروں اور غریبوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ مُغل بادشاہوں کا تو یہ بُہت پسندیدہ پھل تھا۔ کہتے ہیں کہ مُغل بادشاہ ظہیرُالدّین بابر اِس کے پودے ہندوستان لایا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اِس پھل کو بُہت پسند فرماتے تھے۔ حضورؐ کا اِرشاد ہے کہ انار کے رس میں جنّت کے پانی کا قطرہ شامل ہوتا ہے۔ قرآنِ شریف میں بھی اِس پھل کا ذکر آیا ہے۔

ریلوے پلیٹ فارم

فضل بادشاہ، پشتون گڑھی (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

امیر امام نقوی، کراچی (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

سیدہ بتول عابدی، راولپنڈی (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

بلال احمد شاہ، گوجرانوالہ کینٹ (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

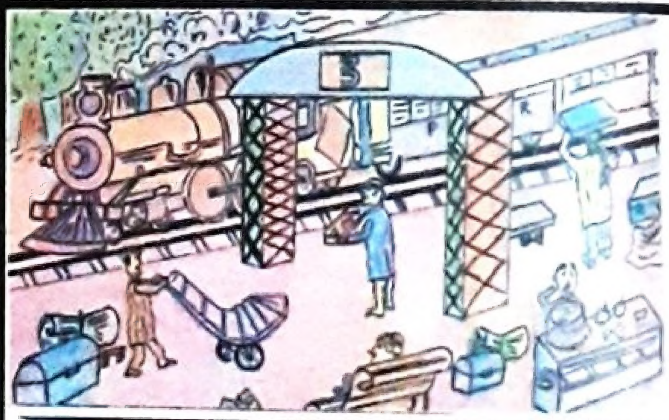

فرا کنول، اقبال ٹاؤن لاہور (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

عبدالسلام رضوان، ربوہ جھنگ (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں۔

فضہ رعنا فیصل آباد۔ مہوش ناصر راولپنڈی۔ محمد فرحان ہمایوں ساہیوال۔ لطیف اللہ قریشی میانوالی۔ فرحانہ خلیل کراچی۔ سعد احمد ملک اسلام آباد۔ سمیعہ نرجس قریشی۔ سعدیہ صدیقی مزنگ لاہور۔ روبینہ خلیل سرگودھا۔ اسلم رضا لاہور۔ فرح ناز چشتی کراچی۔ عینی ناز چشتی کراچی۔ زاہد آفتاب موہری شریف۔ فریحہ فاروق لاہور۔ ذوالقرنین شاہین ممی لنڈان۔ عطیہ پردل تربیلا ڈیم۔ صبیحہ دلشاد راولپنڈی۔ فیصل شہزاد فیصل آباد۔ برہان احمد مغل فیصل آباد۔ فرحان الدین خلجی راولپنڈی۔ الیاس بادشاہ پشتون گڑھی۔ جواد اختر لاہور۔ حماد مجید جنجوعہ فیصل آباد۔ سائرہ نصیر لاہور۔ عادل زبیر موہری شریف۔ آصف علی فرخ ملتان۔ اسماء ناز چشتی کراچی۔ شاہد احمد راولپنڈی۔ عشرت علی ساہیوال۔ جعفر حسین جعفری کوئٹہ۔

آپ ان موضوعات میں سے جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں۔

آخری تاریخ 10 مئی

جون: سمندر کی سیر

جولائی: بس اسٹاپ

سلطان سلیمان ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی فتوحات کے سلسلے کو بڑی کامیابی سے جاری رکھا اس کا اتنا دبدبہ تھا کہ یورپ کی عیسائی ریاستیں اس کے نام سے کانپتی تھیں۔

سلطان سلیمان عثمانی سلطنت کے سلطان سلیم اول کے ہاں 1494ء میں پیدا ہوا۔ 1520ء میں باپ کی وفات کے بعد سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے فوجوں کو نئے سرے سے منظم کیا اور بحیرہ روم میں واقع اپنے بحری بیڑے کو مضبوط بنایا جس سے بحیرہ روم کے کنارے پر واقع تمام سلطنتیں اس کے رحم و کرم پر تھیں۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ 1521ء میں ہنگری پر حملہ کر کے بلغراد کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ 1526ء میں ہنگری کے بادشاہ لوئیس نے ایک بڑا لشکر اکٹھا کیا اور عثمانی سلطنت کی حدود کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ترک فوجوں نے اسے راستے میں ہی جالیا اور عیسائی لشکر کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ بادشاہ بھی میدان جنگ میں مارا گیا۔ سلطان نے ہنگری پر اپنی پسند کا حکمران مقرر کر دیا۔ اس پر آسٹریا کے بادشاہ نے ہنگری پر حملہ کر دیا۔ سلطان کی فوجوں نے ہنگری کے اپنے نامزد حکمران کا ساتھ دیتے ہوئے آسٹریا پر حملہ کر دیا اور اس کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا۔ آخر آسٹریا کے بادشاہ نے خراج اور تاوان جنگ ادا کر کے صلح کر لی۔ ان حملوں سے پورے یورپ کی عیسائی حکومتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جزیرہ رہوڈز کا حکمران بحیرہ روم میں واقع اسلامی بحری بیڑے کے لئے خطرہ بنتا جارہا تھا اس لئے سلطان کے بحری بیڑے نے حملہ کر کے اس جزیرے پر قبضہ کر لیا۔

عیسائیوں کے مذہبی رہنما پوپ نے عیسائی حکومتوں کو سلطان کے بحری بیڑے پر حملہ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس پر اٹلی کے مشہور شہر وینس کے جہاز رانوں نے دوسری عیسائی ریاستوں کو ساتھ ملا کر اسلامی بحری جہازوں پر حملے شروع کر دیئے۔ لیکن ترکی بحری بیڑے کے امیر البحر خیر الدین بار بروسہ نے اپنی جرأت اور جنگی حکمتِ عملی سے دشمن کو شکست فاش دی آخر وینس کے حکمرانوں نے بڑا بھاری تاوان ادا کر کے جان بچائی۔ اب اسلامی بحری بیڑے نے جبل الطارق سے لے کر ہندوستان کے ساحلوں تک بالا دستی حاصل کر لی۔

سلیمان عالیشان کا عہدِ حکومت نہ صرف اپنی فتوحات کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اِس دور میں لوگ خوشحال تھے، ملک کے اندر ہر طرح سے امن تھا۔ علوم وفنون کے میدان میں بھی بے حد ترقی ہوئی۔ عام لوگوں کے فائدے کے لئے جگہ جگہ مسجدیں، مدرسے اور ہسپتال تعمیر کئے گئے۔ اس لئے تاریخ میں اسے سنہری دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان سلیمان عالیشان 36 سال نہایت جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کر کے 1566ء میں فوت ہوا۔